عبدالرحمٰن بجنوری

حالات اور ادبی خدمات

سعیدہ بہاء الدین

★

اشاعت فبروری ۱۹۸۲ء

تعدادِ اشاعت ایک ہزار

کتابت محمد حبیب الدین احمدی

طباعت اعجاز پریس چھتہ بازار، حیدرآباد

قیمت

به تعاون اردو اکیڈیمی، حیدرآباد، آندھرا پردیش

ملنے کے پتے

اردو اکیڈیمی، حیدرآباد، آندھرا پردیش

سعیدہ بہاؤالدین ۵-۶-۱۷۵/۱

آغاپورہ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۱

حبیب اینڈ کمپنی - اسٹیشن روڈ - حیدرآباد۔

انتساب

اپنے والد ابو سعید احمد بہاء الدین مرحوم

کے نام

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

"عبدالرحمٰن بجنوری حالات و ادبی خدمات" سعیدہ بہاء الدین کے ایم فل کا مقالہ ہے جسے وہ حذف و اضافے کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر رہی ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری دورِ جدید کے ایک صاحب طرز مصنف اور منفرد تنقید نگار تھے۔ غالب کے نقاد کی حیثیت سے بھی انھوں نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا تھا۔ ان کی تاثراتی اور تقابلی تنقیدوں کی معنویت سے بحث کی جا سکتی ہے۔ اور ان کے ناقدانہ اکتسابات کے متعلق نقادوں میں اختلافِ رائے بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بجنوری کی تنقیدی بصیرت و ذکاوت، ان کے رچے ہوئے ادبی شعور، وسیع مطالعے، زبان پر قدرت اور ان کی نگارشات کے عالمانہ طرز اور تعمق و گیرائی کا بہرحال اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری کوئی کثیر التصانیف نثر نگار نہیں تھے۔ اُن کے رشحاتِ قلم کا سرمایہ محدود ہے۔ انھوں نے شعر بھی کہے ہیں۔ لیکن کوئی ضخیم دیوان یادگار نہیں چھوڑا۔ بجنوری کی ادبی کاوشیں کمیت نہیں کیفیت کے اعتبار سے وقیع اور قابلِ توجہ ہیں۔

اس سے پہلے بعض رسالوں میں عبدالرحمٰن بجنوری پر چیدہ چیدہ مضامین ضرور شائع ہوئے تھے۔ لیکن ان سے عبدالرحمٰن بجنوری کی بلند قامت ادبی شخصیت اور ان کی فنی مساعی کی تفہیم و تحسین کا حق ادا نہیں ہو سکا تھا۔ سعیدہ بہاء الدین نے پہلی بار بجنوری کے حالاتِ زندگی اور ادبی کارناموں کا مفصل جائزہ لے کر ان کی شخصیت کے بعض اہم

گوشوں پر روشنی ڈالی ہے ۔ اور ان کی نثری و شعری تخلیقات کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس کتاب کے ابتدائی دو ابواب سے سوانحی معلومات اکٹھا کرنے اور شخصیت کا مطالعہ کرنے کی پُر خلوص کوشش کا اندازہ ہوتا ہے ۔ مختلف اصنافِ ادب میں عبدالرحمٰن بجنوری نے جو اضافے کئے ہیں اُن کا اس کتاب میں جائزہ لیا گیا ہے ۔ زیرِ نظر تصنیف کے مختلف باب بجنوری کی مضمون نگاری، انشاپردازی، مکتوب نویسی، تنقید نگاری اور شاعری کا احاطہ کرتے ہیں ۔

سعیدہ بہاءالدین ایک منکسر المزاج، محنتی اور سنجیدہ خاتون ہیں اور اُنھیں ادبی مشاغل سے دلچسپی ہے ۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریسرچ اسکالر ہیں اور میری نگرانی میں عارف الدین عاجزؔ پر تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہیں ۔ میں عزیز شاگرد سعیدہ بہاءالدین کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد دیتی ہوں ۔ مجھے توقع ہے کہ ادبی حلقوں میں ان کی پہلی تصنیف کی اچھی پذیرائی ہوگی ۔

سیّدہ جعفر

لنگر حوض ۔ حیدرآباد ۸ ۰۰۰ ۵

(اے پی)



ابتدائیہ

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو غالب کے نقادوں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کی ادبی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ وہ مشرق اور مغرب کے علوم پر کامل دست گاہ رکھتے تھے اور کئی مشرقی و مغربی زبانوں کے ماہر تھے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ غالب کے کلام پر ایک بسیط مقدمہ لکھ کر ان کے کلام کی عظمت پر روشنی ڈالی اور مغرب کے بلند پایہ شاعروں سے ان کا مقابلہ کر کے ان کے فلسفیانہ تصورات اور ان کی آفاقی بصیرت کو اجاگر کیا۔ بقول ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "بجنوری وہ پہلا شخص ہے جس نے اردو میں انگریزی طرز کی محاسن نگاری کی بنا ڈالی"۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے انتقال کے بعد "محاسن کلام غالب" کی اشاعت عمل میں آئی۔ مقدمہ کی ابتدا بجنوری نے اس مشہور جملے سے کی ہے "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک مقدس وید اور دوسری دیوانِ غالب"۔ اس جملہ نے اردو کے تنقید نگاروں کو چونکا دیا۔ اور بجنوری کے اس بیان کی تائید اور تردید میں بہت سے نقادوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تاحال اس منفرد نقاد پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا نہ ان کی سوانح عمری مرتب کی گئی اور نہ ہی ان کی ادبی خدمات کو کما حقہ، سراہا گیا ہے۔ غالب صدی تقاریب کے سلسلہ میں بعض نقادوں نے ان کی طرف توجہ ضرور کی ہے۔

مفتی انوار الحق صاحب جو بجنوری کے عزیز دوست تھے، بجنوری کے مقدمہ کے ساتھ دیوان غالب شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس بات کی بھی کوشش کی تھی کہ اس کے

ساتھ بجنوری کے حالاتِ زندگی بھی شائع کریں مگر انھیں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ ایک قلیل عرصہ ہی میں بجنوری کے خاندان کے افراد کا انتقال ہو گیا۔ پے در پے سانحات نے ان کے خاندان کو متاثر کر دیا تھا اور مفتی انوار الحق صاحب انتہائی کوشش کے باوجود بجنوری کے خاندانی حالات کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کرنے سے قاصر رہے۔

راقمۃ الحروف کو بڑی کاوش کے بعد عبدالرحمٰن بجنوری کے خاندان کے چند افراد کا پتہ چلا۔ بجنوری کے حقیقی بھانجے مرزا عاشور بیگ صاحب نے جو خان بہادر اکبر بیگ کے فرزند اور مرزا سرور جنگ کے پوتے ہیں بجنوری کے بارہ میں معلومات فراہم کیں۔ انھوں نے بجنوری مرحوم کے چند نجی خطوط بھی میرے حوالے کئے۔ اگر ان کی اور ان کے افرادِ خاندان کی عنایت شامل نہ ہوتی تو یہ مقالہ نامکمل رہتا۔ افسوس ہے کہ کوشش کے باوجود بجنوری کے بچپن کے حالات فراہم نہ ہو سکے۔

اس مقالہ کے پہلے باب میں بجنوری کے جو حالاتِ زندگی تلاش بسیار کے بعد فراہم ہو سکے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں شخصیت اور تیسرے باب میں بجنوری کی مضمون نگاری اور چوتھے باب میں ان کے اسلوب کے محاسن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ ایک منفرد انشاپرداز اور مصنف تھے۔ ان کی طرزِ تحریر قدیم اور جدید معیاری انشاپردازی کا امتزاج ہے۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام "بجنوری کا اسلوب اردو کے چند منفرد اسالیب میں سے ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ ادب کے حسن و توانائی اور تہہ داری کو پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر وارد کر دیتا ہے۔" پانچویں باب میں بجنوری کی تنقید نگاری کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور محاسنِ کلامِ غالب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی تنقید نگاری کی ادبی قدر و قیمت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چھٹا باب بجنوری کی شاعری سے متعلق ہے۔ وہ ایک خوش گو شاعر بھی تھے۔ ان کی نظمیں جدید میلانات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ انھوں نے ہیئت میں بھی بعض نئے تجربے کئے ہیں۔ اس کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتویں باب میں

بجنوری کی مکتوب نگاری سے بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں اپنے عہد کے بعض سیاسی، تمدنی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ خطوط ان کی پُرخلوص شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اپنی رنگینی، شگفتگی اور روانی کے لحاظ سے ان خطوط کو ایک خاص ادبی اہمیت حاصل ہے

یہ مقالہ ۱۹۷۸ء میں ایم۔فل کی ڈگری کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ جس پر اپریل ۱۹۷۹ء میں جامعہ عثمانیہ نے مجھے ایم۔فل کی ڈگری عطا کی۔

ممتاز نقاد ڈاکٹر سیدہ جعفر ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ میری نگران کار رہی ہیں انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اپنی بیش بہا ہدایات سے مجھے مستفید ہونے کا موقعہ عطا فرمایا۔ ان ہی کی توجہ اور کرم فرمائی کی وجہ سے یہ مقالہ مکمل ہو سکا۔ میں ان کی ممنون کرم ہوں۔

میں محترمہ پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ سابق صدر شعبہ اُردو اور حالیہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس جامعہ عثمانیہ کی ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اور میں اپنے تمام اساتذہ جامعہ عثمانیہ کی ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے علمی مواقع فراہم کئے اور مفید مشوروں سے مدد کی۔

جناب ڈاکٹر حامد حسین صدیقی، جناب ڈاکٹر عبد القوی دسنوی، جناب ڈاکٹر ابو محمد سحر اور جناب ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب صاحب کی رہنمائی کی بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس سلسلہ میں نشان دہی کی اور مدد فرمائی۔

میں جناب چندر سری واستو صاحب ڈائرکٹر آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کی مشکور ہوں کہ اس مقالہ کی اشاعت کے لئے مالی تعاون فرمایا۔

سعیدہ بہاء الدین

ایم اے، ایم۔فل (اردو)

۵-۶-۱۷۵ آغا پورہ
حیدرآباد۔ اے۔ پی

حالاتِ زندگی

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری صدیقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان سے ایک شاخ ابتدائے اسلام میں آذربائیجان میں بس گئی تھی۔ اس خاندان کے افراد ہندوستان آئے، اور قاضی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس اعلیٰ خاندان سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا تعلق تھا۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے والد کا نام خان بہادر نورالاسلام تھا۔ کوثر چاندپوری ان کا نام نورالدین یا نورالحسن بتاتے ہیں۔ لیکن بجنوری کے والد کا نام جیسا کہ ان کے بھانجے مرزا عاشور بیگ نے بتایا ہے درِ اصل نورالاسلام تھا۔ [1] جو کوئٹہ میں سفیر تھے۔ اور زیادہ تر کوئٹہ، پنجاب اور بلوچستان میں قیام کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی والدہ کا نام آمنہ خاتون تھا۔ وہ ایک معزز، مذہبی اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد کا نام مولوی ریاض الدین تھا۔ بجنوری کے والد نورالاسلام صاحب کو پانچ لڑکیاں اور تین لڑکے تھے۔ دونوں چھوٹے لڑکوں

---

[1] انٹرویو مرزا عاشور بیگ ۱۰ اپریل ۱۹۷۶ء

کا انتقال ہو چکا تھا۔ عبدالرحمٰن بجنوری ان سب میں بڑے تھے۔ خان بہادر نورالاسلام صاحب سیوہارہ کے رہنے والے تھے۔ وہ ایک مذہب پرست پابند صوم و صلوٰۃ آدمی تھے۔ اور گھر کے افراد کو بھی اسلامی اصولوں کا پابند دیکھنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ضلع بجنور کے قصبہ سیوہارہ میں سنہ ۱۳۰۳ھ مطابق سنہ ۱۸۸۵ء ۱۰ر جون کو پیدا ہوئے بچپن سے ہی وہ نہایت ذہین اور ہوشیار تھے ان کی ابتدائی تعلیم مذہبی انداز کی تھی گھر پر مذہبی تعلیم دی جاتی تھی اور اصول دین سمجھائے جاتے تھے۔ اسکول کی ابتدائی تعلیم انھوں نے کوئٹہ میں ہی حاصل کی۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں انھوں نے کوئٹہ ہائی اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان کامیاب کیا۔ انھوں اوائل عمر ہی سے تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ گھر ہی اعلیٰ تعلیمی ماحول حاصل تھا۔ چنانچہ ایک اچھے تعلیمی ماحول اور جودت طبع نے اعلیٰ علمی مدارج طے کرنے میں آسانیاں مہیا کیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کوئٹہ ہائی اسکول سے سنہ ۱۹۰۲ء میں دسویں جماعت کا امتحان کامیاب کرکے جون سنہ ۱۹۰۲ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں انٹرمیڈیٹ کامیاب کیا اور پھر سنہ ۱۹۰۶ء میں بی اے بھی کامیاب حاصل کی۔ بی اے کے بعد انھوں نے ایل ایل بی میں داخلہ لیا۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ کالج کے طلباء نے ایک زبردست اسٹرائیک کی تھی۔ جو پانچ مہینوں تک جاری رہی۔ عبدالرحمٰن بجنوری اس تحریک کے روح رواں تھے۔ وہ اس تحریک کے لیڈر مانے جاتے تھے۔ ان کے دوست احباب بھی اس تحریک میں حصّہ لیا کرتے تھے۔ اس اسٹرائیک میں ان کے خاص دوست بھی ان کے ساتھ تھے۔ مثلاً تصدق احمد شیروانی، سید محمود، شعیب قریشی، اور عبدالرحمٰن صدیقی وغیرہ ان سب نے مل کر ایک خفیہ تنظیم بھی بنائی تھی جس میں مقالے پڑھے جاتے تھے۔ انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کی تجویزیں پیش کی،

جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ ان لوگوں نے سرسید احمد خان کے مزار پر جاکر یہ عہد کیا تھا کہ جب تک انگریزی تسلط سے نجات حاصل نہیں کریں گے دم نہیں لیں گے۔ اس انجمن کی سرگرمیوں کو خلاف قانون قرار دیتے ہوئے سید محمود، عبدالرحمٰن بجنوری اور تصدق احمد خاں شیروانی کو کالج سے نکال دیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد انہیں جماعتوں میں شرکت کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔[۱] ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری علی گڑھ کے زندہ دل طلباء میں شامل تھے۔ چند طلباء نے ہمبوق کلب کے نام سے ایک کلب قائم رکھا تھا۔ اس میں طلباء نے مختلف تفریحی سرگرمیاں جاری رکھی تھیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری اس کلب کے ممبر تھے۔ اس کلب میں ادبی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں عبدالرحمٰن بجنوری نے علی گڑھ سے قانون کی ڈگری حاصل کرلی اور سنہ ۱۹۱۰ء میں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ روانہ ہوئے۔ وہاں انھوں نے لنکزان یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور بیرسٹری کا امتحان اعزاز سے کامیاب کر کے جرمنی روانہ ہوئے۔ جرمنی میں انھوں نے "فرائی برش یونیورسٹی" میں "اسلامی قانون کے ماخذ" پر تحقیق کام کیا اور جرمنی زبان میں مقالہ سپرد قلم کیا۔ ان کے مقالے پر انہیں "ڈی جے" کی ڈگری عطا کی گئی۔[۲] سنہ ۱۹۱۳ء میں عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ تحقیقی مقالہ آکسفورڈ یونیورسٹی نے شائع کیا۔ اسی زمانہ میں عبدالرحمٰن بجنوری کو سوسائٹی آف کمپریٹیو اسٹڈی آف لا ہالینڈ نے فیلوشپ دیا اور پھر جرمنی کی "فرائی برشی" (بادڑن) یونیورسٹی نے بھی انہیں فیلوشپ کا مستحق قرار دیا۔

مغربی ممالک کے قیام کے دوران میں ڈاکٹر بجنوری نے مختلف ملکوں کی سیر کی۔ ترکی اور قسطنطنیہ میں کافی عرصہ قیام کیا وہاں کے سیاسی قائدین سے ملاقات بھی کی۔ فوجی افسروں

ص۱ مکتوب ڈاکٹر سید محمود ۲۴ رمئی سنہ ۱۹۶۹ء بنام قاسم صدیقی

ص۲ امپیریل لائبریری یوروپین زبانوں میں چھپی ہوئی کتابوں کی فہرست۔ بہ ترتیب مصنفین سنہ ۱۹۴۱ء

سے ملاقات کی اور ترکی کی سیاسی بیداری سے بہت متاثر ہوئے۔ ترکی سے واپسی میں بجنوری نے ایتھنز، برنڈزی، ناپلز، پامپئی اور وینس کی سیاحت کی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر بجنوری ہندوستان واپس آئے۔ ہندوستان میں ان کا قیام زیادہ تر مرادآباد میں رہا۔ انھوں نے مرادآباد میں اپنی وکالت کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر بجنوری کو تعلیمی امور سے دلچسپی تھی، وکالت کا پیشہ انھیں ناپسند تھا۔ سنہ ۱۹۱۵ء کے خط میں بیرسٹر محمود سے خواہش کی تھی کہ اگر سرامام کے توسط سے دو سو یا ڈھائی سو مشاہرہ پر علی گڑھ میں ان کا تقرر ہو جائے تو وہ اس کے لئے تیار ہیں تاکہ علمی کام انجام دے سکیں۔ وکالت میں غیر دلچسپی کی وجہ انھیں اس میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

زمانہ طالب علمی ہی سے ڈاکٹر بجنوری کا خاص رجحان تعلیمی مسائل کی جانب تھا چنانچہ سنہ ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ میں جو تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں "ایم اے او" کالج کے ٹرسٹیز اور ممبرانِ اسٹاف کے علاوہ طلبار کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ طلبار کے نمائندوں میں عبدالرحمٰن بجنوری بھی شامل تھے۔ انہیں مسلم یونیورسٹی کے قیام اور اس کے کانسٹی ٹیوشن سے گہری دلچسپی تھی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اہم علمی تجاویز بھی پیش کی تھیں۔ ان کی اس والہانہ دلچسپی کی ارباب اقتدار نے بہت قدر کی تھی اور جب سنہ ۱۹۱۲ء میں مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے قواعد مرتب کئے گئے تو ڈاکٹر ضیارالدین نے ان کا ایک مسودہ عبدالرحمٰن بجنوری کو جو اس وقت جرمنی میں تھے۔ جرمنی روانہ کیا تھا۔ انھوں نے اس پر ایک جامع تبصرہ لکھ کر ہندوستان روانہ کیا ـــ اور ہندوستان واپسی کے بعد بجنوری نے اس کو شائع بھی کیا تھا۔ بجنوری کو تعلیمی امور سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ انھوں نے علی گڑھ کالج سے اپنا تعلق ہمیشہ باقی رکھا تھا۔ چنانچہ وہ اولڈ بائز اسوسیئیشن "کی جانب سے" مسلم یونیورسٹی اسوسیئیشن کے ممبر رہے اور پھر بعد میں

مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی کے ممبر بھی منتخب ہوئے اسی حیثیت سے انھوں نے اپنا کتابچہ "ہندو یونیورسٹی ایکٹ اور مجوزہ مسلم یونیورسٹی" شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تعلیمی دلچسپی نے انہیں مغربی ممالک کے تعلیمی نظام کے جانچنے کا موقعہ فراہم کیا تھا۔ اور وہ وہاں سے تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق ایک جامع منصوبہ ساتھ لائے تھے۔ ان کے ذہن میں ایک ایسا خاکہ موجود تھا جس کی بنیاد پر ہندوستان کے تعلیمی نظام کی اصلاح کی جا سکتی تھی۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنے چند ہم خیال احباب کی مدد سے ایک کالج قائم کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔ جس کی بنیاد وہ ایثار اور رضاکارانہ خدمات پر رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے اس منصوبہ کی تائید کرنے والوں میں سر امام علی، نواب عماد الملک، ڈاکٹر انصاری، سر عبدالرحیم، شعیب قریشی اور عبدالرحمٰن صدیقی، شامل تھے۔ نواب زادہ محمد حمید اللہ خان نے بھی اس تحریک سے اتفاق کیا۔ اور کالج قائم کرنے میں عملی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس کالج کا نام بھوپال کی والیہ نواب سلطان جہاں بیگم کے نام پر "سلطانیہ کالج" رکھنا تجویز کیا گیا تھا۔ جس کی بیگم صاحبہ موصوفہ نے بخوشی اجازت دے دی تھی اور بغیر کسی سفارش کے چار لاکھ روپیوں کا عطیہ بھی منظور کیا تھا۔[1] نظام حیدر آباد نے بھی تیس ہزار روپیوں کا عطیہ مرحمت فرما کر اس منصوبہ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔[2]

اس کالج کے لئے ڈیرہ دون میں زمین بھی خرید لی گئی تھی۔ ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۱۶ء کو

---

[1] محمد امین زبیری حیات سلطانی، عزیزی پریس آگرہ سنہ ۱۹۳۱ء ص ۱۴۸

[2] محمد فاتح فرخ یادگار بجنوری سول اینڈ ملٹری پریس کراچی سنہ ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۶

نواب زادہ حمید اللہ خان، حکیم اجمل خان اور مفتی انوار الحق صاحب نے اس کالج کے قیام کے سلسلے میں یو پی کے ڈائرکٹر تعلیمات مسٹر ڈیلا فورڈ اور لفٹنٹ گورنر سر جیمس مسٹن دونوں سے ملاقات کی مگر ان دونوں حضرات نے الہ آباد یونیورسٹی سے کالج کے الحاق کی تجویز کو رد کر دیا اس طرح بجنوری کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں مختلف علوم و فنون پر کتابیں اردو میں ترجمہ ہو رہی تھیں عبد الرحمٰن بجنوری کو اردو زبان سے بہت دلچسپی تھی۔ اور وہ مادری زبان میں تعلیم کے حامی تھے۔ اردو کو جدید علمی مسائل کے اظہار کے لائق بنانے کے لئے ان کے پاس بعض عملی تجویزیں بھی موجود تھیں اس سلسلہ میں بجنوری نے انجمن ترقی اردو کے مقاصد سے بھی گہری دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے مولوی عبد الحق صاحب کو علمی اصطلاحات کی تیاری، اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے خطوط اور مضامین کے ذریعہ اپنے خیالات سے آگاہ کیا تھا ۱۹۱۸ء تک جامعہ عثمانیہ کی تیاریاں تکمیل پا چکی تھیں اور پرنسپل کی تقرری کا مسئلہ بھی زیر غور تھا اور اس کے لئے نظام حیدر آباد سے ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کا نام منظور کیا گیا۔ تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ جامعہ عثمانیہ کا آغاز ہوتا ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری انتقال کر گئے۔ ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مراد آباد سے حیدر آباد تلاش روزگار کے سلسلے میں جانا چاہتے تھے۔ نواب زادہ حمید اللہ خان سے ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کی بڑی دوستی تھی۔ وہ اس وقت ریاست بھوپال کے چیف سکریٹری تھے۔ انھوں نے بھوپال میں بجنوری کا مشیر تعلیم کے عہدہ پر تقرر کر دیا اور پانچ سو روپے ماہانہ یافت مقرر کی۔ نواب زادہ حمید اللہ خاں کے مشورہ سے بجنوری نے ریاست بھوپال میں جبری تعلیم کا ایک قانون بنایا۔ اور اس کی اسکیم تیار کی یہ قانون تعلیم جبر یہ بھوپال؛

کے نام سے یکم جنوری ۱۹۱۸ء کو شائع کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا بھوپال میں یہ دو سالہ قیام علمی اور ادبی معرکہ خیزیوں کے لحاظ سے بہت ہی اہم رہا۔ ان کی بدولت بھوپال کی علمی اور ادبی فضاء میں نئی زندگی پیدا ہوئی وہ ہر محفل اور ادبی بزم کے روحِ رواں سمجھے جاتے تھے اور ہر شعر و سخن کی محفل کی رونق ثابت ہوئے۔ "دیوانِ غالب" کے مقدمہ کو جو "محاسن کلام غالب" کے نام سے شائع ہوا ہے انہوں نے بھوپال میں ہی مکمل کیا تھا۔ انھوں نے غالب کے کلام کی پوری چھان بین کی اور اس کی اشاعت کے لئے شاندار منصوبے بنائے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی رفیقہ حیات جمیلہ خاتون بھی اعلیٰ تعلیمی ذوق رکھتی تھیں۔ وہ ایک اعلیٰ مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ انھیں ایک لڑکا محمد فاتح فرخ اور دو لڑکیاں طاہرہ بیگم اور سرداد بیگم تھیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری کے یہ تینوں صاحبزادہ اور صاحبزادیاں اس وقت پاکستان میں مقیم ہیں۔ ان کے دوسرے رشتہ داروں میں مرزا محسن بیگ اور مرزا عاشور بیگ جو مرزا اکبر بیگ کے فرزندوں میں سے ہیں۔ اس وقت حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ یہ دونوں حضرات ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے حقیقی بھانجے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی دو بہنیں مرزا اکبر بیگ سے یکے بعد دیگرے بیاہی گئی تھیں۔ ۱۹۱۸ء میں پورے ہندوستان میں انفلوئنزا پھیل گیا تھا۔ حیدرآباد میں بھی اسی وبا کا بازار گرم تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی بہن زیب النساء جو ایک شیر خوار بچہ کی ماں تھیں اس موذی مرض سے رحلت کر گئیں تھیں۔ ان کا انتقال نواب سرور بیگ کی دیوڑھی واقع چنچل گوڑہ میں ہوا۔ سعیدہ باغ اجالے شاہؒ کی درگاہ میں مرحومہ مدفون ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو اپنی بہنوں سے والہانہ محبت تھی۔ زیب النساء کے انتقال کی خبر سن کر ڈاکٹر بجنوری بھوپال سے

حیدر آباد آئے۔ انھیں اپنی بہن کے اچانک انتقال سے سخت صدمہ ہوا اور رجب واپس بھوپال گئے تو یہ مرض ان پر بھی اثر انداز ہو چکا تھا۔ بھوپال میں بھی اس مرض نے شدت اختیار کر لی تھی اور وہاں ۲۱ اکتوبر سے یکم نومبر تک حکومت کی جانب سے عام تعطیل کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ صہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری بھی اس موذی مرض سے بچ نہ سکے۔ ان کی اہلیہ جمیلہ خاتون بھی اس مرض میں مبتلا تھیں۔ جمیلہ خاتون نے دو تین دن کی علالت میں تین نومبر ۱۹۱۸ء کو انتقال کیا۔ اور اس کے ٹھیک چار دن بعد یعنی ۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو خود عبدالرحمٰن بجنوری نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ کوثر چاندپوری اپنے ایک خط میں، جو انھوں نے راقمۃ الحروف کے بھائی محمد غوث کو تحریر کیا ہے لکھتے ہیں:۔

"بجنوری کے انتقال میں سیاسی اور مقامی حالات بھی کار فرما تھے" صہ۲ اور بجنوری کی بیگم نے انفلوئنزہ سے بمبئی میں انتقال کیا تھا۔ جب بجنوری ان سے ملنے بمبئی گئے تو وہ بھی اس مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اور اسی مرض نے ان کی جان لے لی۔ لیکن کوثر چاندپوری کا یہ بیان کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بجنوری کی بہن انفلوئنزا سے حیدر آباد میں انتقال کر گئیں تھیں وہ ان کے آخری رسوم میں شرکت کے لئے یہاں آئے تھے اور اس مرض نے ان پر یہیں اثر کیا تھا۔ جب وہ بھوپال پہونچے تو مرض نے شدت اختیار کر لی تھی۔ ان کی رفیقہ حیات بھی اسی متعدی مرض میں مبتلا ہوئیں۔ اور پہلے بیگم بجنوری کا اور اس کے چار دن بعد خود بجنوری کا انتقال ہو گیا۔ صہ۳

صہ۱ جریدہ گزٹ بھوپال ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۸ء
صہ۲ مکتوب کوثر چاندپوری ۱۴ جون ۱۹۷۸ء
صہ۳ انٹرویو مسٹر عاشور بیگ ۱۰ اپریل ۱۹۷۸ء

انھیں بھوپال ہی میں لال گھاٹی میں دفن کیا گیا۔ بجنوری کا انتقال ان کے عزیزوں اور بزرگوں کے لئے ایک صدمۂ عظیم تو تھا ہی۔ ان کی وفات سے قوم کا بھی ناقابل تلافی نقصان ہوا اور اردو ادب کی ایک شمع فروزاں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی ؎

"خوش درخشندہ و لے شعلہ مستعجل بود"

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اردو ادب کی ایک نامور شخصیت مانے جاتے ہیں۔ مگر ان کے مفصل حالات زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔ غالب صدی تقریبات کے دوران سنہ ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر بجنوری کی طرف ادیبوں کی اور نقادوں کی توجہ مبذول ہوئی۔ ان پر بہت سے مضامین مختلف رسالوں میں لکھے گئے جن میں ان کی تصنیف "محاسن کلام غالب" کا بطور خاص ذکر تھا۔ اس وقت بھی بجنوری کے جو حالات راقمۃ الحروف کو ان کے حقیقی بھانجے مرزا اکبر بیگ کے فرزند مرزا عاشور بیگ سے حاصل ہوئے تھے۔ وہ اس مقالے میں درج کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی مرقد کا علم بھی کسی کو نہیں تھا۔ ظہور الاسلام صاحب نے "ہماری زبان" میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی آخری آرام گاہ" کے متعلق استفسار فرمایا تھا۔ اس مراسلہ کے جواب میں قاضی عزیز الحسن صاحب نے قبر کی نشاندہی کی تھی کہ یہ قبرستان بھوپال سے ۲.۶ کلو میٹر دور بھوپال اندور روڈ پر سڑک کے بائیں جانب واقع ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لئے لب سڑک ایک بلند دروازہ ہے۔ جس میں آہنی سلاخوں کا پھاٹک لگا ہوا ہے۔ وسط قبرستان میں سطح زمین سے سوا دو فٹ اونچا اور ½ ۱۶ فٹ کا پتھر سے بنا ہوا ایک چبوترہ بھی ہے۔ چبوترہ کے سرے پر چاروں طرف بڑے بڑے پتھروں کا ایک حاشیہ سا بنا دیا گیا ہے۔ حاشیہ کے پتھر یکساں پیمائش کے نہیں

ں۔ اس چبوترہ پر تین قبریں بنی ہوئی ہیں۔ زینہ کے سامنے پہلی قبر کسی چھوٹے سے بچے
کی ہے۔ بڑی قبروں میں سے ایک وسط میں اور دوسری مغرب کی جانب ہے
ور وہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی آخری آرام گاہ ہے۔ اسی پر سنگ مزار نصب
کیا گیا ہے۔ تینوں قبریں پتھر کی جالی سے گھری ہوئی ہیں۔ اور تینوں ایک نمونے
کی ہیں۔ ان کی اونچائی بھی یکساں ہے۔ ڈاکٹر بجنوری کی قبر کی جالی کی اونچائی
و انچ عرض دو فٹ ایک انچ اور اس کا طول ساڑھے چار فٹ ہے۔ جالی ایک
دو جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ قبر کی پائنتی کی جانب شریفہ کا ایک چھوٹا سا درخت
ہے۔ سنگ مرمر کے دو کتبوں کو سیمنٹ سے جوڑ کر ایک محرابی سنگ مزار بنایا
گیا ہے جس کی اونچائی چبوترہ سے دو فٹ نو انچ ہے۔ ایک کتبہ قبر کی جانب
ور دوسرا بیرونی جانب ہے۔ اندرونی کتبہ پر چاروں طرف حاشیہ کندہ ہے
دونوں جانب حاشیہ کی بحیروں پر ایک ایک گلاب کا پھول اور دائرہ کے
اندر چاند تارا کندہ ہے۔ کتبہ پر جو قطعہ تاریخ کندہ ہے وہ مندرجہ ذیل
ہے :۔

کل من علیہا فان
ھوالرحمٰن
ہیہات جہاں میں کیا قیامت آئی
ماتم ہے بپا
رحمٰن کی پیاری صورت آنکھوں سے چھپی
اندھیرا ہوا
یوں کہدو سہیل مصرع سال وفات
تم کھینچ کے آہ
عبدالرحمٰن ڈاکٹر بجنوری
۱۳۳۷ھ
اے آہ کجا

دوسرا کتبہ بیرونی سمت ہے۔ جو سڑک پر سے بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ کتبہ سادہ اور محرابی شکل کا ہے۔ اس کتبہ پر بھی حاشیہ بنا ہوا ہے۔ جس کے اندر قطعہ تاریخ وفات کندہ ہے جو حسب ذیل ہے۔

هُوَ الغَفُور

اقوال جس کے زریں منقوش ہیں دلوں پر
وردِ زبانِ عالم ہے علم کا فسانہ،
جس کی دمِ تکلم گوہر فشاں زباں تھی
کانوں میں گونجتی ہے تقریری عالمانہ
گم لعلِ بے بہا ہے بجنور کا یہاں پر
آغوش قبر میں ہے اپنا در یگانہ
خوابِ گراں سے غافل سویا پڑا ہوا ہے
وہ کون؟ عبدِ رحماں علامۂ زمانہ
سالِ وفات لکھا یہ بیدل حزیں نے
اب علم کا ہے پنہاں اس گور میں خزانہ ص۱

۱۳۴۷ھ

غمگین تحسین سیوہاروی

ص۱ ڈاکٹر ظہورالاسلام، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی آخری آرام گاہ "ماہنامہ آج کل" مئی ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۳

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی آخری آرام گاہ کی تفصیلات ظہور الاسلام صاحب نے آج کل میں ان کے ایک مضمون میں بعنوان "ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی آخری آرام گاہ" کے نام سے شائع کی ہیں۔ بجنوری کی اچانک موت پر جا بجا رنج و غم کا اظہار کیا گیا ان کی ذات قوم کے لئے ایک عظیم سرمایہ تھی۔ اردو ادب میں ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا اس کا پر ہونا ناممکن تھا۔ ریاست بھوپال کی جانب سے ریاست کی سالانہ رپورٹ میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ تحریر کیا گیا تھا۔

"اس موقع پر ہم ڈاکٹر بجنوری مشیر تعلیم کی مرگ بے ہنگام پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ وہ ایک نہایت قابل اور صالح جوان تھے۔ اور ان کی جوان مرگی نے ملک کو بہت جلد ان کی مفید خدمات سے محروم کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم نے یہاں کی جبری تعلیم اسکیم کو بالکل مکمل کر دیا تھا۔ اور اب اسی کے رسم اجرا میں صرف ضروری اسباب اور مکانات مہیا ہو جانے کا انتظار ہے۔"

ڈاکٹر انصاری نے اپنی ایک تقریر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا:-

"ہم کو یکایک اس خاموش کام کرنے والے اور اس نکتہ رس فلسفی کا ماتم کرنا پڑا ہے۔ جس کو خدا نے ایک عالمانہ دماغ عطا فرمایا تھا ایسا دماغ جیسا کہ بہت کم لوگ دنیا میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی سادگی منکسر المزاجی اور پھر اس کے ساتھ ان کا تبحر علمی لوگوں کو اسلامی عہد رفتہ کے علماء اور حکماء کی یاد دلاتا ہے۔"

مجوزہ مسلم یونیورسٹی جب کبھی عالم وجود میں آئے گی تو اس کے اندر مرحوم کے دماغ اور قلم کے نقوش ہمیشہ صاف نظر آتے رہے گی۔ اس طرح مجوزہ سلطانیہ کالج بھی ان کے خداداد تخیل کا ثمر نورس ہے۔ افسوس ہے کہ عملی صورت میں وہ بھی مرحوم کی قابلیتوں کے ثمرے محروم رہے گا۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کا سرمایہ اس تحریک کے بہترین علمبردار کے رخصت ہو جانے سے کچھ اور بھی ہو جائے گا۔ ڈاکٹر بجنوری مرحوم اردو زبان کے نہایت سرگرم اور دل سوز معاون تھے۔ اب جب کہ ان کی زندگی کا ایک شاندار مستقبل قریب آ رہا تھا۔ ہمیں خبر نہ تھی کہ وہ ہم سے رخصت ہونے والے ہیں۔[۱]

ڈاکٹر عبدالحق کو ڈاکٹر بجنوری سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ وہ بجنوری کی علمی استعداد اور خداداد صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ انھوں نے اردو زبان کی ترقی اور ترویج کے لئے بہت سی تجاویز ڈاکٹر عبدالحق کو پیش کی تھیں۔ ان کے انتقال پر ڈاکٹر عبدالحق نے ۱۹۱۸ء کے انجمن ترقی کے سالانہ اجلاس میں اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ قوم اپنے ایک لائق سپوت سے محروم ہو گئی ہے۔ بجنوری کی وفات قوم کے لئے نقصان عظیم ہے۔ اس کی تلافی ناممکن ہے۔

بجنوری کی وفات نے عزیزوں اور رشتہ داروں کے علاوہ ان کے احباب اور دوستوں کو بھی خون کے آنسو رلا دیا۔ مولوی سید ہاشمی نے اپنے رنج و غم کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے۔

۱۔ تقریر ڈاکٹر مختار احمد انصاری (صدر استقبالیہ آل انڈیا مسلم لیگ۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۸ء) اجلاس یازدہم۔

بجنوری مرحوم کی وفات پر

صبح کی آمد نہ تھی اے دیدۂ ظلمت نصیب
وہ کسی فوق النظر تارے کی بھیلی تھی کرن
اس فضائے پر کدورت میں نہ تھا اس کا وطن
اب کہاں وہ نور شیریں ہاں مگر اس کی جھلک
ہو اگر باقی تو ہو شبنم کی نازک روشنی
یا سر شب کھلنے والی موتیا کی چاندنی

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی جواں مرگی کے پیش نظر ان کی ادبی کاوشوں کا سرمایہ بہت قلیل محسوس ہوتا ہے۔ مگر ان کی حیثیت قابل قدر شاہکار کی سی ہے۔ بجنوری نے بہت ہی کم عمری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کی تحریر و تصنیف کا کل زمانہ دس بارہ سال کا ہے۔ اسی میں وہ دور بھی شامل ہے۔ جب کہ وہ مغربی ممالک میں تھے۔ انھوں نے سنہ ۱۹۰۶ء میں بی اے کامیاب کیا تھا۔ اسی وقت سے ان کی تصانیف کا آغاز ہوتا ہے۔ اب تک بجنوری کی تحریروں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ باقیاتِ بجنوری ہے۔ جس کو محمد فاتح فرخ عبدالرحمٰن بجنوری کے صاحبزادہ نے سنہ ۱۹۴۰ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع کیا تھا۔ اس میں تین مضامین بارہ مکاتیب اور پندرہ منظومات شامل ہیں۔

دوسرا مجموعہ یادگار بجنوری کے نام سے کراچی میں سول اینڈ ملٹری پریس سے سنہ ۱۹۵۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں بجنوری کے دس مضامین گیارہ مکاتیب اور چار منظومات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسری تحریریں بھی ہیں

جو ابھی منظر عام پر نہیں آئی ہیں۔ ان میں سے بعض بجنوری کے طالب علمی کے دور کی یادگار ہیں۔ ان میں سے اکثر مضامین بجنوری کے دور میں شائع ہونے والے رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ بجنوری کی تحریروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مضامین مکاتیب اور منظومات مضامین میں اکثر دوسری زبانوں کے ترجمے شامل ہیں۔ بجنوری کے تمام ادبی سرمایہ میں سب سے زیادہ "محاسن کلام غالب" کی اہمیت ہے۔ بجنوری کے اس کارنامے کو ایک شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ راقمۃ الحروف کو بجنوری کے رشتہ داروں سے ان کے تحریر کردہ بعض نجی خطوط ملے ہیں۔ ان کے علاوہ بجنوری کی بعض قدیم نظمیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ مخزن، زمین دار سائنس، علی گڑھ منتھلی اور نیرنگ خیال کے قدیم شماروں میں بجنوری کے بعض مضامین ملے ہیں جو خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

شخصیت

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری اردو ادب کی قدآور شخصیتوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک باعزت اور علم دوست خاندان میں جنم لیا تھا۔ ایک شریف خاندان کی اعلیٰ خصوصیات ان میں موجود تھیں۔ بجنوری گندمی رنگت اور دلکش خدوخال کے مالک تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن سے ذہانت اور تجسس جھلکتا تھا۔ میانہ قد نے ان کی شخصیت کو جاذب نظر بنا دیا تھا۔ بجنوری خوب صورت اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی فطری خوبیاں ان کی سیرت اور شخصیت میں مزید اضافہ کرتی تھیں۔ بجنوری ہمیشہ نہایت صاف ستھرا لباس زیب بدن کیا کرتے تھے اور وہ جو بھی لباس پہنتے وہ ان کی جامہ زیب شخصیت کو اور خوب صورت بنا دیتا تھا۔ گھر میں ہمیشہ کرتا اور پائے جامہ پہنتے باہر جاتے تو ترکی ٹوپی اور شیروانی زیب تن کرتے۔ انھیں اپنے لباس کا خاص خیال رہتا تھا۔ نفاست اور صفائی ان کے مزاج کا جز بن چکے تھے۔ کپڑے ہمیشہ اپنی مرضی اور پسند سے کسی اچھے درزی سے سلواتے تھے۔ مغربی ملکوں میں رہنے اور ان کے طور طریقوں کو پسند کرنے کے باوجود بجنوری مشرقی رکھ رکھاؤ کے قائل تھے۔ اور مشرقی لباس کو ترجیح دیتے تھے۔ ؎۱

؎۱ مسٹر عاشور بیگ سے انٹرویو ۱۰ر اپریل ۱۹۷۸ء

عبدالرحمٰن بجنوری کے عادات واطوار اوران کی شائستگی وسنجیدگی ان کے اعلیٰ خاندانی اوصاف کے علاوہ خودان کی فطری خوبیوں کی بھی پروردہ تھی۔ ان میں شرافت اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ والدین اور بزرگوں کے ساتھ ہمیشہ ادب واحترام سے پیش آتے تھے اور انہیں حفظ مراتب کا خاص خیال رہتا تھا۔ بجنوری کو اپنے چھوٹے بہنوں اور بھائیوں سے والہانہ محبت تھی۔ ان کے لئے ہمیشہ ایثار اور مروت سے کام لیا کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی حبیب الرحمٰن سے انھیں بہت محبت تھی۔ ہمیشہ اس کی بھلائی اور اس کے درخشاں مستقبل کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ حبیب الرحمٰن کو بجنوری نے جرمنی سے ایک خط لکھا تھا۔ جس میں انہوں نے بعض مفید ہدایتیں درج کی تھیں اور اپنے بھائی کو ان پر عمل کر کے ایک کامیاب زندگی گزارنے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کی یہ ہدایتیں ایک طالب علم کے لئے بیش بہا خزانہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حبیب الرحمٰن ابھی انٹرمیڈیٹ میں ہی تھے کہ انتقال کر گئے۔ اس سے بجنوری کو ناقابل بیان صدمہ ہوا۔ حبیب الرحمٰن کو بجنوری پیار سے جنو کہا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں بھی انھیں اسی نام سے یاد کیا ہے۔ وہ اپنے اس بھائی سے بہت پیار کرتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد جیسا کہ انھوں نے اپنے ایک غیر مطبوعہ خط مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۱۷ء کو اپنی بہن کو لکھا ہے کہ وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کی بہن زیب النساء جو مرزا اکبر بیگ سے جو مرزا سرور بیگ کے فرزند تھے۔ حیدرآباد میں بیاہی گئی تھیں انفلوئنزہ سے انتقال کر گئیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس سے بھی بہت متاثر ہوئے تھے۔ انتقال کی خبر بھوپال پہونچی تو وہ فوراً حیدرآباد آئے اس وقت تک مرحومہ کی لاش گھر ہی پر موجود تھی۔ وہ میت سے لپٹ کر ایسے، پر درد انداز میں رو رہے تھے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی آب دیدہ ہو گئیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنی بہن سے کتنی زیادہ محبت تھی۔ انھیں اپنے عزیزوں اور

رشتہ داروں سے بہت محبت تھی ہمیشہ ان کی بھلائی کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری غذا کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ اعتدال کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کھانا ہمیشہ وہی کھانا چاہیئے جو جزو بدن ہو سکے۔ بہت سی اشیاء جس میں زبان کا چٹخارہ ہو اکثر صورتوں میں مضر ثابت ہوتی ہیں۔ ہمیشہ کھانے کے اوقات کی پابندی کیا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ حقیقی انسان اسی وقت بنتا ہے جب کہ نہ صرف روح بلکہ روح کا مسکن جسم بھی اچھی حالت میں ہو۔ اور اچھی غذا کے بغیر یہ ناممکن ہے۔ [۱]

بجنوری ورزش اور کھیل کو دکو انسان کے لئے ضروری خیال کرتے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ اگر آٹھ نو گھنٹے مطالعہ کریں تو چار پانچ گھنٹے ورزش اور کھیل میں بھی صرف کریں تاکہ صحت برقرار رہ سکے۔ بجنوری کو تنہائی میں فطرت کا مطالعہ بے حد پسند تھا۔ اور اس کے لئے وہ صبح خیزی کو ضروری سمجھتے تھے۔ وہ اکثر اس خیال کا اظہار کیا کرتے تھے کہ صبح خیزی سے خیالات میں رفعت و بلندی پیدا ہوتی ہے۔ وہ صاف ہوا، صاف پانی اور طاقتور اور اچھی غذا کو انسانی صحت کے لئے لازمی تصور کرتے تھے۔ [۲]

بجنوری کی شخصیت کا قابل قدر پہلو یہ تھا کہ وہ ہر شئی کو پوری توجہ اور غور و فکر سے دیکھتے اور اسی کے کسی پہلو کو تشنہ نہ چھوڑتے تھے۔ جس چیز کو قابل عمل پاتے اسی کو اختیار کرتے۔ ان میں بعض خاص خوبیاں تھیں۔ جو دوسروں کو بے حد متاثر کرتی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالحق بجنوری کے بے حد مداح تھے۔ انھوں نے بجنوری کی خداداد

---

[۱] بجنوری کا خط بنام حبیب الرحمن صفحہ ۴۶ باقیات بجنوری مکتبہ جامعہ دہلی

[۲] " " " ۷۰ " " "

صلاحیتوں سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

"سب سے قابل تعریف اور لائق قدر اس شخص کا کیرکٹر یعنی سیرت تھی اس کی نیکی شرافت نفس اور خاموشی میں ایک جادو تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس کے ملنے والے اس پر فدا تھے۔ نوجوانی کے عالم میں ایسی خوبیاں اور کمالات تھے جو بڑی عمر میں بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔" ؎۱

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی شخصیت کو نکھارنے میں علی گڑھ کا بھی بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء سے سنہ ۱۹۰۹ء تک انھوں نے علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے خاص دوستوں میں تصدق احمد خاں شیروانی، سید محمود، شعیب قریشی اور عبدالرحمٰن صدیقی وغیرہ شامل تھے۔ یہ سب اپنے دور کے نامور اور ممتاز شخصیتیں تھیں۔ اپنے تمام ہم جماعتوں اور ساتھیوں میں بجنوری کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ کالج کے دور میں ان کی شخصیت میر کارواں کی سی تھی۔ بجنوری کی زندہ دلی ذہانت اور علمی استعداد نے کالج کے ہر فرد کو ان کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ اس کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں:۔

"علی گڑھ کے فرزندوں میں سب سے سعید اور قابل قدر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہی تھے۔" ؎۲

ہر ملاقاتی ان کے خلوص اور خوبیوں کے ان مٹ نقوش لے کر واپس لوٹتا تھا۔ ان کی سحر انگیز شخصیت ہر کس و ناکس کو متاثر کرتی تھی۔ نامور ادیب کوثر چاند پوری ایک استفسار پر لکھتے ہیں کہ بجنوری سے ان کے والد کے دیرینہ مراسم تھے۔ کوثر صاحب نے بجنوری صاحب سے ان کے بچپن میں ملاقات کی تھی۔ کوثر صاحب لاہور کے وکٹوریہ کالج میں داخلہ

؎۱ مکتوب کوثر چاند پوری ۱۴ر جون سنہ ۱۹۷۸ء

؎۲ تقریر ڈاکٹر عبدالحق اجلاس انجمن ترقی اردو منعقدہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء

چاہتے تھے۔ اور اسی سلسلہ میں بجنوری سے مدد کے طالب تھے۔ انہیں کے الفاظ میں اس ملاقات کا حال لکھا جاتا ہے :-

"میں ڈاکٹر بجنوری سے بچپن میں بھوپال ہی میں ان کے بنگلے پر صبح کے وقت ملا تھا۔ وہ نائٹ ڈریس میں تھے اور شیو کر رہے تھے۔ مجھے کمرہ ہی پر بلا لیا تھا۔ یہ میرے والد مرحوم کے نام کا اثر تھا۔ میں وٹرنری کالج لاہور میں داخلہ چاہتا تھا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ بھوپال پرنسیز آصفیہ طبیہ اسکول میں داخل ہو کر اپنے آبائی فن کی تعلیم حاصل کروں۔ یہ اسکول بعد میں کالج بن گیا تھا۔ میں نے وہیں پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کا لہجہ بہت میٹھا نرم اور متانت آمیز تھا۔ زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ میں ایک ہی بار ملا تھا۔ وہ میرے ہم وطن تھے۔ میرے والد مرحوم کے ان کے اسلاف سے مراسم تھے"[۱]

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی شخصیت بھوپال میں ادبی محفلوں کی جان تھی۔ انھوں نے یہاں کی ادبی محفلوں کو نئی زندگی بخشی۔ دیوان ثاقب کے دیباچے میں شہنشاہ حسین رضوی لکھتے ہیں :-

"یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو کے فاضل ادیب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری بقیدِ حیات تھے۔ مرزا صاحب (ثاقب) کے پہونچتے ہی بھوپال میں دن رات شعر و شاعری کے چرچے ہونے لگے۔ شام کی ملاقاتیں اکثر بزمِ سخن بن جاتیں لیکن مرزا صاحب کے زمانہ قیام بھوپال میں جتنی شعر و سخن کی صحبتیں ہوئیں ان سب کے روحِ رواں ڈاکٹر بجنوری ہی تھے"[۲]

---

[۱] مکتوب کوثر چاندپوری ۱۴؍ جون ۱۹۷۶ء

[۲] شہنشاہ حسین رضوی دیباچہ دیوان ثاقب صفحہ ۲

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا مختصر سا دورِ حیات دوسروں کے لئے نمونہ بن سکتا ہے۔ ان میں اپنے مذہبی گھرانے کے پورے پورے تاثرات ملتے ہیں۔ وہ مذہب کی پابندی کو ضروری سمجھتے تھے۔ مغربی ممالک کے سفر کے دوران میں بھی انھوں نے نماز اور روزہ کا پورا پورا خیال رکھا۔ وہ اپنے والد کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"بحمد للہ رمضان بخیر و خوبی ختم ہوا۔ تمام روزے پورے ہوئے۔ کوئٹہ کے روزہ داروں کا حال معلوم ہوا۔ اللہ قبول فرمائے۔" لے

اس سے پتہ چلتا ہے کہ بجنوری ایک پابند صوم و صلوٰۃ آدمی تھے۔ اور دوسرں کو بھی اس کی ہدایت کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ اور ان کے سب دوست ان کو دیوانہ وار چاہتے تھے۔ بجنوری دوستوں کے سلسلہ میں بہت فراخ دل اور ہمدرد واقع ہوئے تھے۔ ہمیشہ ان کی مدد اور اعانت کے لئے تیار رہتے تھے۔ بجنوری کو اپنے ذاتی مفاد سے زیادہ دوسروں کے مفاد کا خیال رہتا تھا۔ بجنوری کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک بلند حوصلہ آدمی تھے۔ جس کسی سے دوستی کی اس کو ہمیشہ نبھایا، انہیں خوشامد سے نفرت تھی۔ طبیعت میں خودداری بہت زیادہ تھی۔

عبدالرحمٰن بجنوری جب ترکی پہونچے وہاں جنگ بلقان کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ مسلمانوں میں جہاد کا جوش و خروش دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ اپنے والد کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"جو شخص یہ دیکھنا چاہے کہ ترک کسی وجہ سے زندہ قوم ہیں اور عثمانیوں کی ملت میں حیات اور زندگانی اور روح کیا چیز ہے اس کو آج استنبول میں آکر دیکھنا چاہیئے۔۔۔ کسقدر خوردو کلاں

لے مکتوب بنام نور الاسلام باقیات بجنوری مکتبہ جامعہ دہلی سنہ ۱۹۴۰ء صفحہ ۱۶۰

طفل و بزرگ مرد اور عورت سب کو خوشی ہے عید کے دن اس کی دسویں کسر رونق نہ تھی جتنی، استنبول میں آج کل ہے"۔ ص۱

عبدالرحمٰن بجنوری ترکوں کے جذبہ جہاد اور ان کے جوش و خروش سے بہت خوش ہوئے تھے اور کئی خطوط میں ترکوں کے اس اسلامی جذبہ کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر جب اس جنگ میں یورپ کے مقابلے میں ترکوں کو شکست ہو گئی تو وہ بہت رنجیدہ ہو گئے۔ اس سلسلہ میں اپنے والد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اب تو یہ کیفیت ہے کہ ایک ہفتہ بھر سے شب میں نیند بہت کم آتی ہے جب دن میں اطالیوں کی صورت دیکھتا ہوں تو اور زیادہ جنون پیدا ہوتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں چلا جاؤں جو آرام نصیب ہو۔ الٰہی کہاں میں جا کے رہوں کہ مجھ کو سکون حاصل کوئی گھڑی ہو"۔ ص۲

بجنوری کے بھانجے مرزا عاشور بیگ صاحب کا بیان ہے کہ بجنوری نہایت حساس اور نیک نفس آدمی تھے وہ ہمیشہ صاف اور سلیس اردو بولنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گفتگو میں ہمیشہ خالص اور غیر ملوث زبان بولنی چاہئیے۔ مگر تحریر میں، دوسری زبانوں اور ان کے ادب سے خوشہ چینی کرنے کو وہ مستحسن سمجھتے تھے۔ گفتگو میں انگریزی کے الفاظ اور اظہارات کو وہ بے محل خیال کرتے تھے۔

بجنوری کے مزاج میں توکل بہت زیادہ تھا اور وہ ہمیشہ خدا پر بھروسہ کیا کرتے تھے۔

ص۱ مکتوب بنام نورالاسلام صاحب ۱۴ر اکتوبر ۱۹۱۲ء باقیات بجنوری مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۴۰ء ص ۱۷۴

ص۲ " " " یکم نومبر ۱۹۱۲ء " " " " ص ۱۶۰

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری
کی
مضمون نگاری

جدید اردو نثر کا آغاز دراصل ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے ہوتا ہے۔ یوں تو اس سے قبل ہی اردو کی ترقی کے لئے کوششوں کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اردو نثر کو سادہ اور سلیس بنانے میں غالب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے ایک نئی نثر کی ابتدا کی۔ ان کے خطوط اردو ادبیات عالیہ میں ایک انفرادی شان لئے ہوئے ہیں۔ غالب کے زمانے میں فصیح و بلیغ عبارت لکھنے پر زور دیا جاتا تھا غالب نے اس سے انحراف کرتے ہوئے ایک نئی راہ اختیار کی۔ سرسید اور حالی بھی غالب ہی کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سرسید کا دور اردو ادب کا زرین دور خیال کیا جاتا ہے۔ انہوں نے معیاری زبان کی سختیوں کو کم کیا اور اس کو وسعت بخشی تاریخ، سوانح، تنقید، ناول، افسانے اور ڈراموں وغیرہ کے لئے راہ ہموار کی اور ادب کو ایک مقدس سنجیدگی عطا کی۔ زبان کو تہذیب اور سماج کی آواز سمجھا "تہذیب الاخلاق" اور پھر اس کے مقابلے میں "اودھ پنچ" نے اردو ادب کی ترقی میں نمایاں رول ادا کیا۔

حالی سرسید کے سچے پیرو اور رفیق تھے۔ حالی کی سرسید سے عقیدت ایک عظیم تحریک

کی شکل میں ابھرتی ہے حالی نے اس تحریک کو شعر و ادب کی شکل دیدی۔ انہوں نے اردو شاعری میں اصلاحات کی بہت سی تجویزیں پیش کیں اور مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ سے اردو نثر کو نئے تنقیدی نظریات سے مالامال کر دیا۔

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری سر سید اور حالی کے سچے پرستاروں میں تھے۔ غالب کے کلام میں انہوں نے الہامی کیفیات محسوس کی تھیں۔ انہوں نے اردو نثر کو نئی وسعتیں نئے تصورات اور نئے مغربی افکار سے سنوار دیا۔ بجنوری محض ایک اچھے نقاد ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک بلند پایہ شاعر اور مضمون نگار بھی تھے۔ ان کے مضامین کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن انہوں نے جو بھی لکھا ہے وہ اپنی انفرادیت کے لحاظ سے قابل توجہ ہے۔ بجنوری کے مضامین سے ان کی طرز بیان اور ان کی مضمون نگاری کے اہم خدوخال کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ مغربی ادبیات کے مطالعہ سے اپنی تحریروں میں ایک نئی معنویت پیدا کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر بجنوری اردو ادب کے سب سے اولین مضمون نگار سمجھے جاتے ہیں۔ جنہوں نے انگریزی ادبیات سے استفادہ کیا اور اردو ادب میں مغربی دانشوروں کے اقوال کو مناسب مقام عطا کیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور فرماتے ہیں:

> ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری وہ پہلا شخص ہے جس نے اردو میں انگریزی طرز کی فاضلانہ محاسن نگاری کی بنا ڈالی ۔[۱]

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے چند مضامین، مکتوبات اور منظومات کو ان کے فرزند محمد فاتح فرخ نے مکتبہ جامعہ دہلی سے سنہ ۱۹۴۲ء میں باقیات بجنوری کے نام سے

۱۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ روح تنقید ۱۹۴۲ اعظم اسٹیل پریس حیدرآباد ص ۱۵

شائع کیا تھا۔ اس میں پہلا مضمون "گیتا نجلی" ہے یہ ٹیگور کی تصنیف گیتا نجلی کے ایک
باب کا ترجمہ ہے۔ اس میں انہوں نے ٹیگور کے مذہبی تصورات اور ان کے ادبی خو
کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ٹیگور کے اخلاقی نظریات اپنشد
کی تعلیمات پر مبنی ہیں۔ اپنشدوں کی تعلیم روحانیت کی حامل ہے ٹیگور کا مذہب
جبریہ نہیں بلکہ قدریہ ہے۔ وہ زندگی کی لذت جہدِ حیات میں پاتے ہیں۔ انہوں نے
"سادھنا" میں لکھا ہے:

> زندگی کی خوشی کام ہی میں ہے۔ کام میں ایک عجیب لذت ہے۔ یہ لذت تکمیلِ حیات میں ممد و معاون ہے۔ [1]

گیتا نجلی میں عبدالرحمٰن بجنوری نے پہلے تو عرب کے اس ویران ریگستان کا نقشہ پیش
کیا ہے۔ جہاں کے مکین جاہل تھے اور خدا کی پرستش کے بجائے بتوں کی پرستش کیا کرتے
تھے ستاروں کو خدا مانتے تھے مگر ان کا دل مطمئن تھا۔ عربوں کا فارس پر اور مسلمانوں کا ہند
پر تسلط ہوا تو دونوں کے مذہبی خیالات نے ایک دوسرے پر اثر کیا اس طرح ایران میں
تصوف کو فروغ ہوا۔ ہندو شاعری ابتدا ہی سے وحدت الوجود سے متاثر رہی ہے۔
ٹیگور کی شاعری ہندو شاعری ہے۔ ان کا عقیدہ روحانیت پر مبنی ہے۔ مگر وہ
نشینی اور چلہ کشی کے خلاف ہیں۔ وہ رہبانیت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور روح
کی بقا کے لئے تنگ و تاریک فضا کی بجائے عام انسانوں سے میل جول اور جد و جہد کو
زیادہ موزوں اور مناسب تصور کرتے تھے۔ اس مضمون میں بجنوری نے ٹیگور کے

---

[1] ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری باقیات بجنوری گیتا نجلی مکتبہ جامع دہلی ص ۱۵

مذہبی خیالات اور روحانیت کے مسئلہ کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ٹیگور کے فلسفہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خدا کا جلوہ خانقاہ کی تنگ و تاریک فضاء میں دیکھنے کی بجائے کائنات کے دوسرے مظاہر میں بھی اس کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔

"باقیات بجنوری" کا ایک عالمانہ مضمون "وضع اصطلاحات علمیہ" ہے۔ اس میں بجنوری نے قومی زبان کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ زبان ہی کی وجہ سے انسان دوسری مخلوقات سے برتر مانا گیا ہے۔ "زبان ملک اور ملت کے قلب کی حرکت کی صدا ہوتی ہے"۔ زبان سے غفلت برتنا سخت غلطی ہے۔ اہل روما نے یونان کی زبان اختیار کرلی جب ہی تو روما کی تہذیب انحطاط کا شکار ہوگئی۔ ملک و ملت کی ترقی کے لئے مادری زبان سے اچھا کام لیا جاسکتا ہے۔ بجنوری نے ہندو مسلمانوں کے نفاق کو اردو زبان کا دشمن قرار دیا ہے۔ اور وہ اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان کے دو رخ تصور کرتے ہیں۔

علماء اور قدیم تعلیم یافتہ لوگ ابتدا میں اردو کو فارسی اور عربی کے مقابلے میں کمتر جان کر اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتے تھے۔ اکثر خلاف محاورہ اردو میں عربی عبارت کا ترجمہ ہوتا تھا۔

اکثر اردو کی ضروری کتابوں کے جو ترجمے ہوئے ہیں ان کی زبان عام فہم نہیں ہے۔ بجنوری جدید تعلیم یافتہ گروہ سے بھی زیادہ مطمئن نہیں ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ مدرسوں میں اردو زبان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی جاتی اور اعلیٰ تعلیم میں اس کا عمل دخل نہیں ہے۔ اہم مضامین کی تعلیم انگریزی کے ذریعہ

ہوتی ہے۔ اور انگریزی ہی کالجوں اور مدرسوں کا ذریعہ تعلیم ہے اس طرح طالب علم اپنی مادری زبان سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ اور بدیشی زبان کی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ رہے ہیں۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ اہل قلم انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی کو مایہ ناز تصور کرتے ہیں۔ بجنوری کا خیال ہے کہ ایک طرح سے ترقی کا انحصار مادری زبان میں تعلیم پر بھی ہوتا ہے۔ تعلیم اسی وقت فائدہ بخش ثابت ہو سکتی ہے جب اس سے ملک کو فائدہ پہونچے وہ لکھتے ہیں:۔

> وہ اعلیٰ ترقی جس کے ہم آرزومند ہیں اور وہ سچی آزادی جس کی ہم خواہش رکھتے ہیں۔ اردو کی کف پا کے نیچے ہے۔ زبان وطن کا کلام ہے اور وطن کا کام وطن کے کلام سے جدا نہیں جب تک طلباء کو ہندوستان میں مادری زبان میں تعلیم نہ دی جائے گی تعلیم جزو حیات بن نہیں سکتی [1]

ڈاکٹر بجنوری کا نظریہ تعلیم یہ ہے کہ مدارس اور کالجوں میں طلبا کو وہی مضامین پڑھائے جائیں جو عصری ضروریات سے ہم آہنگ ہو اور ان کا ذریعہ تعلیم ان کی مادری زبان ہونی چاہیے۔ وہ اس خیال کے حامل ہیں کہ قدیم علوم کا مطالعہ تنقیدی نظر سے کرنا چاہیے کیونکہ نئے علوم نے بہت سے نظریات کو باطل قرار دیا ہے۔ اس لئے نئی معلومات اور نئے نقطہ نظر کو اپنانا ضروری ہے۔

ڈاکٹر بجنوری اس جدید تعلیم کو بھی مفید نہیں تصور کرتے جو مذہب سے بیر سکھاتی ہے۔ اور مغرب کی کورانہ تنقید پر مائل کرتی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری باقیات بجنوری مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۸۰ء صفحہ ۲۴

ان کا خیال ہے کہ مغرب کی برکتیں مشرق ہی سے حاصل کی ہوئی ہیں۔ اور "مغرب مشرق کا ادنیٰ خادم ہے"۔ ہم دوسرے مذاہب کے قوانین کی پیروی کرنے لگیں تو اس سے ہمیں نقصان ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی قوانین زندگی میں ہماری اچھی رہبری کر سکتے ہیں۔

بجنوری نے اپنے "مضمون اصطلاحات علمیہ" میں اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ اردو میں عربی، فارسی، اور ہندی کی مصطلحات کو رائج کیا جا سکتا ہے۔ اگر جرمنوں نے دوسری زبانوں کے مصطلحات کو اپنی زبان میں ڈھال لیا ہے تو انگریزوں نے یونانی اور لاطینی مصطلحات کو جوں کا توں اختیار کیا ہے۔ اردو والوں کو چاہیئے کہ تمام علوم و فنون کے مصطلحات کے ترجمہ کے لئے فارسی اور عربی سے مدد لیں اور یا تو فارسی یا عربی یا پھر ہندی مصطلحات کو اپنائیں۔ عربی کے مصطلحات وضع کرنا بجنوری کے خیال میں زیادہ مناسب اس لئے نہیں کہ ان کو سمجھنے کے لئے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے اور عربی لغات عام فہم نہیں ہوتیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندی مصطلحات اختیار کرنے میں زبان کی لطافت باقی نہیں رہتی۔ بجنوری نے فارسی کو عربی اور ہندی زبان پر ترجیح دی ہے۔ اور مشورہ دیا ہے کہ ایک مصطلحات کی لغت تیار کریں اور ان میں موقعہ بہ موقعہ ترمیم اور اصلاح و قطع برید کرتے رہیں۔

انجمن ترقی اردو کا ایک سالانہ جلسہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق کی درخواست پر ڈاکٹر بجنوری نے جلسہ میں پڑھنے کے لئے ایک مضمون "اردو زبان کی ترقی" کے عنوان سے روانہ کیا تھا۔ جو ڈاک کی غلطی کی وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکا۔ ڈاکٹر بجنوری کی خواہش تھی کہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے ایک رسالہ شائع کیا جائے۔ بجنوری کی وفات کے بعد یہ رسالہ شائع ہونا شروع ہوا۔ اس مضمون کو

انجمن ترقی اردو نے اپنے رسالہ میں شائع کر دیا۔

اس مضمون میں بجنوری نے کم و بیش انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جو انہوں نے وضع اصطلاحات علمیہ میں ظاہر کئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ملک میں اتحاد کی کمی اور قومیت کے تصور کی کمزوری کی اصل وجہ اختلاف السنہ ہے۔ وہ ہندو اور مسلمانوں کے اختلاف کو اردو زبان کا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے ہیں۔ ہندو ہندوستان میں ہندی کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اور مسلمان اردو زبان کو دونوں یہ نہیں جانتے کہ دونوں زبانیں دراصل ایک ہی پودے کی دو شاخیں ہیں۔ جب اردو کو سنسکرت میں لکھا جاتا ہے تو وہ ہندی کہلاتی ہے۔ جب ہندی کو عربی رسم الخط میں لکھتے ہیں تو وہی اردو کہلاتی ہے۔ یہاں بجنوری نے غلطی کی ہے۔ کیوں کہ زبان کا دار و مدار محض رسم الخط پر نہیں ہوتا زبان دراصل خیالات کا بیرونی پردہ ہوتی ہے۔ اس قسم کا اختلاف دلوں کے اختلاف کی دلیل ہے۔ آخر میں وہ یہ کہتے ہیں کہ تمام اختلافات کو بھول کر متحد ہو جانا اور زبان کی ترقی کے لئے کام کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

تشبیہات کے متعلق بجنوری نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ فارسی کے حصار کو توڑ دیا جائے اور اردو والے وہی تشبیہات استعمال کریں جو ہمارے ملک کے حالات سے مناسبت رکھتے ہوں۔

بجنوری نے ایک دائرۃ المعارف کو ترتیب دینے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ جس میں ایسے قابل شخصوں کو مامور کیا جائے جو اسلامی علوم میں دسترس رکھتے ہوں۔ اور نئے مسائل پر بھی جن کی نظر گہری ہو۔ وہ بہترین اردو کتابوں کا انتخاب کر کے انہیں انگریزی اور بعض ہندوستانی زبانوں میں منتقل کریں تاکہ اردو والوں

کے خیالات سے دوسرے بھی استفادہ کریں اور ان کی علمی صلاحیتوں سے واقف ہوں۔

"باقیات بجنوری" میں "سیر لکھنؤ" کے عنوان سے بجنوری کا ایک دلچسپ مضمون ملتا ہے۔ اس میں انہوں نے بڑے پرلطف انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے شاہاں اودھ کی تصاویر کو دیکھنے کے بعد اپنے جو تاثرات بیان کئے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ وہ سعادت خاں شاہ اول واجد علی شاہ آخر نواب منصور جنگ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، سعادت علی خاں اور نصیر الدین حیدر وغیرہ کی تصاویر کو دیکھتے ہیں اور پھر ان حکمرانوں کی زندگی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں۔ اس مضمون کو پڑھ کر شاہاں اودھ کی اصلی تصویریں ذہن میں ابھر آتی ہیں۔ ڈاکٹر بجنوری نے اودھ کے دس حکمرانوں کی قلمی تصویریں پیش کی ہیں۔ ان کے لباس صورت کے نقوش اور وضع قطع کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ابھارا گیا ہے اور "سیر لکھنؤ" بجنوری کی مضمون نگاری کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتا ہے اور اس کو پڑھ کر ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بجنوری میں ایک اچھا مضمون نگار بننے کی صلاحیتیں موجود تھیں۔

"داشتہ آید بکار" اس خط نما مضمون یا ہدایت نامہ کو ڈاکٹر بجنوری نے جرمنی سے اپنے بھائی حبیب الرحمٰن کے لئے سپرد قلم کیا تھا۔ حبیب الرحمٰن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ جا رہے تھے۔ بجنوری علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے انہوں نے اپنے زمانہ تعلیم کے تجربات سے جو نتائج اخذ کئے تھے ان پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ علی گڑھ میں لباس، طعام کھیل ورزش تفریح عادات واطوار اور وہاں کی پوری تعلیمی زندگی کا ایک واضح اور روشن مرقع اس مضمون میں،

موجود ہے۔ بجنوری کا یہ مضمون رشید احمد صدیقی کی "آشفتہ بیانی میری" کے بعض بیانات کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی نے اپنی اس تصنیف میں مرقع نگاری کے جولازوال مرقعے پیش کیے ہیں۔ اور علی گڑھ کی تہذیبی و تعلیمی زندگی کا جو جیتا جاگتا نقشہ پیش کیا ہے وہ "شئی دیگر" معلوم ہوتی ہے۔

یہ مضمون دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ اس لئے اہم ہے کہ انہوں نے اپنے تجربات کو بڑے پر اثر ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حالؔی کے سچے پرستاروں میں ڈاکٹر بجنوری بھی شامل ہیں۔ انہوں نے صحیح معنوں میں حالؔی کی پیروی کی ہے۔ بجنوری کے اہم مضامین میں ان کا مضمون "حالؔی" بھی شامل ہے۔ یہ مضمون حالؔی کی زندگی کے پورے نقوش کو واضح کرتا ہے۔ اور ان کے تمام کارناموں پر محیط ہے۔ انہوں نے حالؔی کے کارناموں کو سراہتے ہوئے ان کی زندگی کے تین دور مقرر کیے ہیں۔ پہلا دور حالؔی کی نوجوانی کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں انہوں نے جو اشعار کہے ہیں۔ ان میں روایتی غزل گوئی کا رنگ موجود ہے۔ مگر حالؔی کے اور دوسرے ہم عصر شعراء کے کلام میں جو فرق نمایاں نظر آتا ہے وہ جذبۂ پاکیزگی ہے۔ محبت کے جذبہ کو جس مقدس انداز میں حالؔی نے پیش کیا ہے اس کو بجنوری نے بہت ہی سراہا ہے۔ محاسن کلام غالب میں بھی بجنوری نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ شاعر پیغمبر کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ شاعر کے کلام کو الہامی تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ حالؔی کے متعلق بھی یہی خیال ظاہر کرتے ہیں:۔

"شاعر گو پیغمبر ہوتا ہے اور ماں کے پیٹ سے ہی نبی پیدا ہوتا ہے مگر ملکۂ نبوت کو ترقی پذیر ہونے اور کمالات حاصل کرنے کے

لئے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر بزم غالب ابھی جمنے بھی نہ پائی تھی کہ محفل درہم برہم ہوگئی۔ اب مولانا حالی مایوس ہو کر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔"

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزم شعراء میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تیری رام کہانی چھوڑی ؎۱

حالی کا دوسرا دور انقلابی دور تھا۔ غدر کے بعد عوام بہت کچھ سنبھل چکے تھے، سرسید احمد خاں کی رہنمائی اور حالی کی رجز خوانی نے عوام کو پوری طرح بیدار کر دیا تھا۔ حالی کے اس دور کی یادگار "مدو جزر اسلام" ہے بعض اہم قومی نظمیں بھی انہوں نے اس دور میں لکھی تھیں۔

"مسدس" کو بجنوری نئی شاعری کا سنگ میل سمجھتے ہیں۔ اور حالی کو وہ شیکسپیر اور ملٹن کا ہم پایہ شاعر تصور کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حالی شیکسپیر نہیں تو اردو کے ملٹن ضرور ہیں" ؎۲

یہ مضمون بجنوری کی تقابلی تنقید کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ محاسن کلام غالب میں انہوں نے غالب کا موازنہ دوسرے بڑے شعراء سے کیا ہے تو

؎۱ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری حالی روح انتخاب مرتبہ تاجور نجیب آبادی (یادگار بجنوری)

؎۲ " " " " " صفحہ ۳۵۷ "

اپنے اس مضمون میں انہوں نے حالی کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لئے مغربی شاعروں سے ان کا مقابلہ کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بجنوری اردو کے فن کاروں کی عظمت کے اظہار کے لئے مغربی شاعروں اور ادیبوں کا سہارا لئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔

حالی کے تیسرے دور کی ابتدا بجنوری کے خیال میں ۱۸۹۸ء میں ہوتی ہے۔ اس وقت تک سرسید کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور مولانا حالی نے قوم کی اصلاح کا بار امانت سنبھال لیا تھا اور وہ سرسید کے سچے جانشین بن چکے تھے۔

ڈاکٹر بجنوری نے بحثیت مرثیہ گو بھی حالی کے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے حالی کے دو مرثیوں کی بابت اظہار خیال کیا ہے۔ ایک تو غالب کا مرثیہ اور دوسرا سرسید کا۔ پہلا اردو میں لکھا ہوا ہے اور دوسرا فارسی میں۔ ان دونوں مرثیوں کے متعلق بجنوری کہتے ہیں :۔

> غالب کا مرثیہ تعلقات شخصی کے منقطع ہونے کی ایک درد انگیز تصویر ہے۔ اور ٹینسن کے ان میموریم کی حیثیت رکھتا ہے سرسید کا مرثیہ قومی ماتم کا دردناک بیان ہے جس میں نالہ و بکا کی آواز ہر شہر و دیار کو اٹھائے ہوئے ہے۔ اور وہ قدیم یونان کی ان تقریبوں سے مشابہ ہے جو بڑے آدمیوں کے جنازوں پر تدفین سے پہلے کی جاتی تھیں۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے مرثیوں کی مثال ہماری زبان میں نہیں ہے ؎

؎ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری حالی روح انتخاب مرتبہ تاجور نجیب آبادی (یادگار بجنوری)

ڈاکٹر بجنوری نے حالی کی نظموں "چپ کی داد" اور "تحفتہ الاخوان" کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان میں وہ پہلا سا جوش و خروش نہیں ہے مگر کہتے ہیں:۔

ان کو پڑھ کر انجیل کے وہ مقامات یاد آجاتے ہیں۔ جہاں حضرت عیسٰی بنی اسرائیل کے سامنے وعظ فرما رہے ہیں اور مجھے اس بات کے کہنے میں دریغ نہیں کہ شاعر اس زمانے میں پورا پیغمبر معلوم ہوتا ہے۔ مگر سب سے بڑی بات جو حالی میں موجود ہے اور کسی میں نہیں کہ ان کا کام اور کلام ایک ہے۔ ان کا کلام ان کی زندگی کا مرقع ہے۔[۱]

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو ترجمہ سے بہت دلچسپی تھی۔ انہوں نے فرانس کے نامور مصنف برگساں کے ایک مضمون کا ترجمہ کیا تھا۔ جو خواب کے عنوان سے رسالہ سائینس جنوری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں بجنوری نے خواب کی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ باصرہ، سامعہ، لامسہ، حافظہ اور رویا کے مدد سے خواب متشکل ہوتے ہیں۔ جس طرح خارجی روشنی کا بندہ آنکھوں پر جاگتے اور سوتے میں اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح نیند کی حالت میں بھی اثر ہوتا ہے۔ اور کسی آواز کے اثر سے بھی خواب نظر آسکتے ہیں۔ حافظہ کی مدد ہی سے خواب نظر آتے ہیں۔ عالم بیداری میں یادیں ہمیشہ دماغ میں آمد و شد جاری رکھتی ہیں اور دماغ کو مصروف

۱۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری حالی روح انتخاب مرتبہ تاجور نجیب آبادی صفحہ ۲۵۷

رکھتی ہیں۔ دراصل خواب ان واقعات کا ہلکا سا خاکہ ہوتے ہیں۔ جو دن میں لوگوں کو پیش آتے ہیں۔ گہری نیند میں جو خواب نظر آتے ہیں وہ عام طور پر یاد نہیں رہتے۔ لیکن کبھی کبھی ان کے بعض اجزاء محفوظ رہ جاتے ہیں اور اس وقت کی حالت کا احساس ناقابل بیان ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں دور ہوا میں اڑ رہے ہوں یا ماضی کی عمیق گہرائیوں میں سے واپس آ رہے ہوں۔ بجنوری لکھتے ہیں کہ ہم خواب میں ماضی بعید، عہد طفولیت اور شباب کے دور کو قدیم رنگ میں دوبارہ دیکھ سکتے ہیں۔

اسرار خودی اور "رموز بے خودی" اقبال کی ان دو مثنویوں پر ڈاکٹر بجنوری نے انگریزی میں "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں مضمون لکھا تھا۔ ڈاکٹر مالک رام نے اس مضمون کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو نیرنگ خیال کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔ اسی مضمون کو شیخ محمد اکرم نے اردو میں ترجمہ کر کے ہمایوں نومبر ۱۹۲۰ء میں ان الفاظ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

"یہ مضمون آج سے بارہ سال پہلے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے ایسٹ اینڈ ویسٹ میں لکھا تھا جس جوش بیان اور وسعت مطالعہ کا ثبوت ان کے مقدمہ دیوان غالب میں ملتا ہے اس میں بھی موجود ہے علاوہ ازیں اقبال کے "پیغام" کے مختلف پہلوؤں پر اس مختصر مضمون میں جو جامع اور باترتیب تبصرہ انہوں نے کیا ہے۔ شاید ہی اور کسی جگہ کیا گیا ہو"۔

ڈاکٹر بجنوری نے اقبال کے خیالات کو عالمانہ اور مدبرانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اقبال کی شاعری کو وقت کی ناگزیر ضرورت قرار دیا ہے۔ فارسی ادب انحطاط پذیر ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر اقبال نے اس میں نئی جان ڈالنے کی کوشش کی۔ اقبال نے ان کا پیام جو خالص اسلامی بنیادوں پر قائم تھا۔ قوم کے گوش گزار کرنے میں اپنی پوری استعداد اور قوت صرف کردی۔ ان کی شخصیت ان دونوں مثنویوں "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" سے نمایاں ہوتی ہے۔

اقبال کے نظریہ کے مطابق موجودہ اسلامی ممالک کے تنزل کی وجہ مسلمانوں کی بے عملی اور توحید الٰہی پر اعتماد کی کمی ہے۔ اقبال کے نزدیک جاودان، پیہم رواں، ہر دم جواں، زندگی ایک حقیقت ہے۔ جو اسلامی اصولوں پر عمل کرکے سنواری جاسکتی ہے۔ اقبال کے کلام نے مشرقی ادبیات میں خود اعتمادی اور نئی روح پھونکی ہے اور ساری عمارت کو امید کی بنیادوں پر نئے سرے سے تعمیر کیا ہے۔ اقبال بھی نطشے کی طرح حریت فکر و فعل کا حامی ہے۔ اس نے نوجوانوں کو مقابلہ کرنے اور عزم صمیم سے کام لینے کی دعوت دی ہے۔ اقبال کو عہد نبوی کے شب و روز اور حجاز کی سرزمین سے والہانہ محبت ہے۔ وہ مسلمانوں کی موجودہ پر تصنع زندگی سے نفرت کرتا ہے۔ اور مسلمانوں کو ایک حقیقی با عمل اسلامی زندگی گزارنے کی دعوت دیتا ہے۔

ڈاکٹر بجنوری نے اپنے مضمون "میل جول" میں معاشرتی زندگی کے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں اچھی معاشرت کا ایک بھرپور تصور موجود ہے۔ ڈاکٹر بجنوری کا خیال یہ ہے کہ اگر دو اشخاص ایک ہی

فرقے یا ایک ہی حیثیت کے ہوں تو آپس میں یگانگت ہو سکتی ہے۔ یا پھر ان دونوں کا کسی ایک خاص بات میں دلچسپی لینا ان کے اتحاد کا سبب ہو سکتا ہے۔ تیسرا سبب بجنوری نے یہ بتایا ہے کہ "دو آدمیوں کی شخصی خصوصیات میں یگانگت ان کے زیادہ ربط و ضبط کا باعث ہوتی ہے۔" [۱]

دو دوستوں کے مذاق میں ہم آہنگی بھی دوستی کو استوار رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اور وہ اسی آدرش کو ذہن میں رکھتے ہوئے موجودہ سوسائٹی پر نظر ڈالتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ایک بہترین مقرر بھی مانے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے علی گڑھ کے طالبعلمی کے دور میں کئی کارہائے نمایاں انجام دیں۔ علی گڑھ کالج میں طلباء نے ایک انجمن جو اردوئے معلّیٰ کے نام سے موسوم تھی قائم کی تھی۔ اس میں مشاعرے اور تقریریں بھی ہوتی تھیں۔ طلباء علمی مضامین پڑھا کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے جو اس وقت بی۔اے کے طالب علم تھے اور سیوہاردی تخلص کرتے تھے اپنا مضمون "مسلۂ ارتقا اور کون" پڑھ کر جلسے میں حاضرین سے داد حاصل کی تھی۔ اس مضمون میں عبدالرحمٰن بجنوری نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو ہمیشہ اپنے ارتقا اور وجود کے متعلق تجسس رہتا ہے۔ اس اسرار پر سے پردہ اٹھانے کی فلسفیوں اور سائنس دانوں نے بڑی کوشش کی مگر ناکام رہے ہیں۔ دو نظریے عام طور سے بیان کئے جاتے ہیں۔ پہلا نظریہ مسلۂ ارتقا ہے جو فلسفیوں

---

[۱] ڈاکٹر بجنوری، میل جول مخزن جنوری ۱۹۱۰ء صفحہ ۳۰۔

کا پیش کیا ہوا ہے۔ ڈارون نے علم حیوانات، علم نباتات اور علم طبقات الارض وغیرہ کی مدد سے یہ ثابت کیا تھا کہ تمام موجودات اور بالخصوص زمین، جمادات، نباتات اور حیوانات اور نوع انسانی چند طبعی تبدیلیوں کی بدولت عالم وجود میں آئے ہیں۔ اور نظام شمسی میں مختلف تبدیلیوں کی وجہ سے روئے زمین کی تمام مخلوق اور جمادات و نباتات وغیرہ زندگی پائے ہیں۔ یہ دراصل وہ ذرات تھے جو سورج سے جدا ہو گئے تھے۔ حکمائے یورپ کا خیال ہے کہ پہلے پہل نباتات کی ادنی صورتوں کا ظہور ہوا۔ پھر بتدریج ان میں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ درختوں میں نمو اور بالیدگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اسی طرح حیوانات بھی پہلے پہل سیپ اور موتی کی شکل میں تھے ان سے گزر کر آبی جانوروں کی اور حشرات الارض کی نشوونما ہونے لگی۔ جو رفتہ رفتہ بہتر شکلوں میں پائے جانے لگے۔ پرند اور چوپائے اور بالآخر بندر اور پھر انسان جو اشرف المخلوقات مانا گیا ہے، بنایا گیا۔ حکمائے اسلام نے مسئلہ ارتقا سے اختلاف کرتے ہوئے "مسئلہ کون" کو بتانے کی کوشش کی ہے مسئلہ کون کے مطابق ارتقا، یہاں ختم نہیں ہوتا۔ ہجویری کہتے ہیں کہ "انسان کو اس جسم مرئی سے قطع تعلق کرنا بھی مقصود ہے۔ اور روح کو جو نور ہے اور جسم سے محسوس نہیں اس قدر جلا دینا منظور ہے کہ عکس الٰہی اس میں پرتو فگن ہو سکے" ان کا خیال ہے کہ انسان اور کل کائنات ارتقا کی مختلف منزلیں ہیں جو ابھی مکمل نہیں ہوئی ہیں۔ انسان اسی وقت مکمل کہلائے گا جب کہ وہ جسم سے گزر کر عالم قدسی میں پہونچے گا اور وہی عالم اس کا ابدی مقام ہوگا۔

اسلوب

اسلوب کی تعریف میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسلوب صرف بہترین اظہار خیال یا بہترین طرز تحریر کو نہیں کہا جا سکتا۔ ٹینی سن نے کہا ہے کہ :

"قابل توجہ بات یہ نہیں ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ کس طرح کہہ رہے ہیں"۔

اسلوب میں مختلف الفاظ ایک خاص ترتیب سے بیان کئے جاتے ہیں، ان میں مصنف کی شخصی خصوصیات کو خاص دخل ہوتا ہے۔ اسلوب صرف طرز تحریر سے نہیں بلکہ مصنف کی انفرادی فکر اور زاویہ نظر سے پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور کہتے ہیں

"اسلوب مصنف کی تمام زندگی کا عکس ہوتا ہے"۔ [۱]

مڈلٹن مرے نے اسلوب کے متعلق اس رائے کا اظہار کیا ہے :

"اعلیٰ وارفع اسلوب وہ ہے جس میں اس لفظ کے دونوں مفاہیم شریک ہیں۔ اسلوب زیادہ سے زیادہ شخصیت اور شخصیت کے علاوہ ہر چیز کے کم سے کم امتزاج کا نام ہے۔ ایک طرف تو اس میں مخصوص اور شخصی جذبات مرکوز ہوتے ہیں تو دوسری طرف یہ تخلیقی شئے کی صورت میں شخصی جذبات کا مکمل اظہار ہے۔ [۲]

اسلوب کے لئے فکر کی انفرادیت ضروری ہے یہی انفرادیت ادیب کو ایک اچھا

۱۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ اردو کے اسالیب بیان صفحہ نمبر ۱۱۰

۲۔ Middletion Murry. The Problem of Style

انشاپرداز نباتی ہے۔ خیالات کی ندرت کے بغیر ایک اچھا اسلوب بھی بے جان اور مردہ نظر آتا ہے۔ انداز بیان میں نکھار، بانکپن اور رنگینی اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کہ مصنف کی فکر میں ندرت اور انفرادیت موجود ہو۔

ہولنگ ورتھ لکھتا ہے۔ "اسلوب جسم اور فکر روح ہے۔ روح کی طرح فکر بھی اپنے جسم (اسلوب) سے خود کو ظاہر کرتی ہے۔ ؎۱

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مضامین میں ندرت بانکپن اور نکھار ہے۔ اس سے ان کے مضامین میں انفرادیت پیدا ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں اردو الفاظ کی، بہ نسبت فارسی الفاظ زیادہ ملتے ہیں۔ عربی فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے مگر اس سے تحریر میں ایک خاص روانی اور بے ساختگی پیدا ہوگئی ہے ان کے اسلوب تحریر میں حکیمانہ شان اور شاعرانہ انداز جھلکتا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر بجنوری کی تحریر کی روانی اور دلکشی کے متعلق لکھتی ہیں :-

بجنوری ایک مخصوص طرز بیان کے مالک ہیں ان کی تحریروں میں عربی اور فارسی کے موٹے موٹے الفاظ کے باوجود ایک خاص روانی بے ساختگی اور شگفتگی ملتی ہے۔ ؎۲

ڈاکٹر بجنوری غالب کے مداح ہی نہیں پرستار تھے اس لئے ان کے طرز فکر اور طرز ادا سے بجنوری کا اثر پذیر ہونا ایک فطری بات معلوم ہوتی ہے۔

؎۱ A Primer of Literary Criticism Holingworth.

؎۲ ڈاکٹر سیدہ جعفر اردو مضمون کا ارتقاء صفحہ ۲۰۸

بجنوری کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تشبیہات اور استعارے بہت ہی خوب صورت اور دل نشین استعمال کئے ہیں۔ تحریر میں بعض جگہ دھیما سا طنز یہ انداز بھی پایا جاتا ہے مگر کہیں بھی یہ ناگوار اور تلخ نہیں ہونے پاتا بجنوری کی تحریر میں جو بے ساختگی اور دلکشی ہے۔ وہ دل کو موہ لیتی ہے اور قاری ان کی تحریر کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ ان کے انداز بیان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ قاری کے دل و دماغ پر ادب کے حسن اور توانائی کے احساس کو طاری کر دیتا ہے ڈاکٹر خورشید الاسلام نے بجنوری کے اسلوب تحریر کی ان الفاظ میں ستائش کی ہے:۔

بجنوری کا یہ اسلوب اردو کے چند منفرد اسالیب میں سے ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ ادب کے حسن اور توانائی کو پڑھنے والے کے دل و دماغ پر وارد کر دیتا ہے۔ [1]

ڈاکٹر بجنوری کے طرز تحریر کی خاص خوبی یہ ہے کہ دوسرے تمام ادیبوں اور نقادوں کی طرح انہوں نے جا بجا اپنی تحریر میں انگریزی الفاظ کا استعمال بالکل نہیں کیا ہے۔ اپنے مضامین میں انہوں نے اردو لفظ کے بجائے انگریزی لفظ استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے۔ ان کی استعداد علمی اتنی زیادہ تھی کہ انہیں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بجنوری کے اسالیب کا میدان محدود ہونے کے باوجود الفاظ کا وسیع خزانہ موجود تھا۔ ڈاکٹر بجنوری کے اسلوب تحریر میں مغربی طرز کے محققانہ اسلوب کی جھلکیاں پائی جاتی

---

[1] ڈاکٹر خورشید الاسلام تنقید کے بنیادی مسائل صفحہ ۲۶۹

ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں مغربی مفکروں کے اقوال کو نقل کر کے انہیں ایک عالمانہ شان عطا کی ہے۔

یہ اردو زبان کی بدقسمتی تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے بہت کم عمری میں اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ اور ان کی کوششوں کا آغاز ہی سے اختتام ہو گیا۔ اگر اس قسم کی کوششوں کو کچھ ثبات نصیب ہوتا تو شاید اردو ادب کے سرمایہ میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ ہوتا۔ عبدالرحمٰن بجنوری کے مضامین کی تعداد زیادہ نہیں اس کے باوجود ہم محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں اسلوب کی جدتیں پیدا کی ہیں۔ دراصل کسی ادیب کے اسلوب بیان سے اس کی شخصیت کے نقوش واضح ہوتے ہیں۔ مڈلٹن مرے نے اسلوب اور اس کے مسائل کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ وہ اسلوب میں شخصیت اور انفرادیت پر زور دیتا ہے۔

"اسلوب فطری طور پر شخصیت کا روبہ عمل لانا ہے کیوں کہ اسلوب فرد کے تجربات کا راست اظہار ہے"۔

دراصل ایک تصنیف آئینہ کی طرح ہوتی ہے جس میں مصنف مع اپنی قلبی گہرائیوں کے نظر آجاتا ہے۔

روڈلف فلپس نے ڈکسن کے اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

" اسلوب وہ ہے جس سے مصنف کی شخصیت واضح ہو جائے کہ وہ کیا ہے اور کیسی ہے"۔ ؎

؎ The element of Style - Rodulf Philips.

اسلوب میں شخصیت کے نقوش کے علاوہ مصنف کی افتادِ طبع اور اس کے ماحول کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ ادیب کا اسلوب اس کی انفرادیت اور اس کے ماحول کی گوناگوں کیفیات کا پروردہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے دور میں اردو اسالیب کے میدان میں تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ سنہ ۱۸۳۲ء میں جب فارسی کی بجائے اردو سرکاری اور عدالتی زبان قرار دی گئی اور مدرسوں میں اردو کی ایسی کتابیں لکھی جانے لگیں جن کے موضوع مغربی طرز کے تھے تو اس سے اردو کے لفظی خزانے میں گراں بہا اضافہ ہوا اور اسلوب بیان میں تکلف اور تصنع کی بجائے بے ساختگی اور سادگی پیدا ہوتی گئی۔ سنہ ۱۸۶۳ء میں سرسید نے غازی پور میں "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی۔ اس کا مقصد ہر قسم کی علمی، کتابوں کو مغربی زبانوں سے اردو میں منتقل کرنا تھا۔

"سائنٹفک سوسائٹی کا ترجمان "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گزٹ" تھا۔ جس سے اردو کے اسالیب پر کافی اثر ہوا۔

سرسید کے تہذیب الاخلاق کو اردو نثر کے اسالیب بیان کی اصلاح کرنے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کی مخالفت اور حمایت میں جو رسالے اجراء ہوتے تھے ان میں بھی دانستہ یا نادانستہ وہی زبان استعمال ہوتی تھی جو سرسید رائج کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح اردو نثر میں ایسے اسالیب بیان جنم لینے لگے جن میں تصنع کی بجائے سادگی اور عبارت آرائی کی بجائے مواد کی اہمیت کی طرف توجہ کی جانے لگی۔

اگرچہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری بعض امور میں سرسید کے ہم خیال نہیں تھے۔ وہ ایک حریت پسند مسلمان تھے۔ اور زندگی و ادب کے بارے میں ان کے تصورات سرسید سے مختلف تھے تاہم، ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ بجنوری نے نثر کو سادہ جامع اور بے ساختہ بنا کر سرسید کے مشن کو آگے بڑھایا ہے۔ بجنوری اردو نثر کو علمی وقار، متانت اور سنجیدگی

کا حاصل دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے آرائشی تشبیہات و استعارات، غیر ضروری رنگینی اور لفاظی سے پرہیز کیا ہے۔ اور اپنے ما فی الضمیر کی بڑے روانی اور بلیغ انداز میں عکاسی کی ہے۔ اس کے باوجود ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ بجنوری کی نثر محض سادہ نہیں اس میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی۔ اور اسی میں ان کے انداز بیان کی سحر آفرینی کا راز مضمر ہے۔

مکتوب نگاری

مکتوب نگاری وہ صنف نثر ہے جس میں کاتب تحریر اپنا مافی الضمیر، اپنا کردار، اپنے اخلاق و عادات اور دوسروں کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر سکتا ہے۔ خطوط میں وہ اپنے اور دوسروں کے حالات بلا کم و کاست بیان کر سکتا ہے۔ ان سے انسان کی سیرت اور کردار کی اصلیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے "مکتوبات حالی" کے مقدمہ میں، لکھا ہے:-

> جب انسان اپنے کسی دوست کو خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ اٹھ جاتا ہے۔ وہ ہر مسئلہ اور ہر شئے کے متعلق جیسا اس کا خیال ہوتا ہے۔ صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے۔ وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے۔ نہ دوسروں سے جھجکتا نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ہے۔ اس وقت نہ اسے خوف لائم ہوتا ہے۔ اور نہ نکتہ چینی کا کھٹکا۔ خطوط کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھا لیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسانی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسرے ذریعہ سے

بھوپال
۵-نومبر-۱۸ء

حمیدہ عزیزہ زاد بانہا عمرہا

بعد دعائے زادرانی -

تار کے بعد کوئی خط نہیں آیا - سب کا دل
تمہارا اور برخوردار طلحہ کی خیریت کا جویاں ہے
مفصل خیریت نامہ جلد لکھو یا لکھوا کر روانہ کرو
تاکہ اس کے مطالعہ سے سب شاد ہوں -
ہر وقت تم دونوں تمہارا اور بچے کی
سلامتی اور عافیت کی دعا ہے خداوند کریم
مولود مسعود کو ماں باپ کے سایہ میں
عمر دراز اقبالمندی کی بابرکت زندگی عطا فرماوے
اور اس کی ذات سے خاندان کا نام
روشن اور تابان ہو - آمین بطفیل رسول الثقلین -

پیارے جگر گوشہ کو مفصل ملاک سے

البلاغ دنیا -

یہاں خدا کا فضل شامل حال ہے -
ہر وقت دھیان تمہاری جانب لگا ہوا ہے
اللہ تعالیٰ خوش و خرم شاد آباد رکھے -

زیادہ دعا -

عبدالرحمن

نہیں ہو سکتا۔ ص۱

خطوط بھی ادب عالیہ میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ دنیا کی تمام زبانوں میں خطوط کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لاطینی میں ہارلیس اور سسبرو، انگریزی میں ملٹن، بیکن، کوپر گولڈ اسمتھ، بائرن، کوئین وکٹوریہ وغیرہ کے خطوط ایسی تصانیف ہیں جو ان زبانوں میں خاص اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔

۱۸۴۹ء سے اردو خطوط نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے قبل فارسی میں مکتوبات اور رقعات کا عام رواج تھا۔ اردو خطوط کی ابتدا بھی فارسی کے تتبع ہی میں کی گئی تھی۔ طویل آداب والقاب، پرتکلف عبارت، فرسودہ مضامین اور رسمی باتیں خطوط میں بیان ہوتی تھیں۔ تشبیہوں اور استعاروں سے خطوط کو سجایا جاتا تھا۔ غرض خطوط کا ایک خاص مزاج تھا جس کی پیروی ہر معیاری مکتوب نگار کے لئے لازم تھی۔ ڈاکٹر عبداللہ لکھتے ہیں:

"اردو خطانگاری کا اولین دور فارسی انداز سے متاثر تھا وہی القاب و آداب وہی سرنامے وہی عنوان وہی اختتامیے وہی رنگ انشار وہی مادی تکلف وہی رنگینی مگر انیسویں صدی کے ربع اول میں سادگی کا کچھ میلان پیدا ہوا۔" ص۲

کسی فن کار کی شخصیت کو اجاگر کرنے میں اس کے خطوط کا بھی بڑا حصہ ہوتا ہے۔ خطوط اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ آئینہ صرف ظاہری شکل وصورت کا عکس پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن وہ کسی شخص کے جذبات واحساسات کی عکاسی پیش نہیں کر سکتا۔ خطوط

ص۱ ڈاکٹر عبدالحق۔ مقدمات عبدالحق مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی مکتوبات حالی ص ۳۶۸ سنہ ۱۹۷۲ء کوہ نور پریس دہلی

ص۲ ڈاکٹر عبداللہ اردو خطانگاری نقوش مکاتیب نمبر سنہ ۱۹۵۷ء ص ۲۷ ادارہ فروغ اردو لاہور۔

ہی کو ادب عالیہ میں ظاہری اور باطنی خوبیوں کو پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس لئے انھیں ادب عالیہ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

کسی شخص کی شائستگی کا اندازہ اس کی گفتگو سے لگایا جاتا ہے۔ مگر خطوط گفتگو سے زیادہ اس کی تہذیب وشائستگی کا پتہ دیتے ہیں۔ جان لارک کہتا ہے۔

"گفتگو میں آواز، لہجہ، چشم آبرو کی حرکات اور مشافہہ کے دوسرے وسائل مغز سخن کی خامیوں کو چھپا دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات بے کار بات بھی اثر کر جاتی ہے۔ خط ان خارجی وسائل سے محروم ہوتا ہے مگر جو شخص اس کے باوجود خط کو موثر اور بلیغ بنا سکتا ہے وہ درحقیقت ایک شائستہ اور تربیت یافتہ انسان ہو سکتا ہے"۔ ص۱

خطوط نجی اور عوامی دونوں قسم کے ہوتے ہیں ایسے خطوط سے جن کا تعلق عوام سے ہوتا ہے۔ کسی شخص کی سیرت وکردار کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے خطوط سب کے مطالعہ میں آئیں گے اس لئے وہ اپنے اصلی خیالات کو پیش کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اس کے برعکس نجی خطوط میں مکتوب نگار کی اصلی شخصیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس لئے نجی خطوط کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ نجی خطوط میں جو خاص کر اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں۔ ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے۔ تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے اور انسان اپنی اصلیت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

اچھے خطوط کی پہچان ان کا اسلوب اور لطافت ہے۔ ان میں ملاقات کی تمام اغراض و

ص۱ ڈاکٹر سید عبداللہ اردو خط نگاری نقوش مکاتیب نمبر ۱۹۵۷ء ص ۱۷

مقاصد پورے ہونے چاہیئے۔ کسی طرزِ نگارش کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے خطوط میں گفتگو ہی کا سا انداز پیدا کر دے۔ مرزا غالب کے خطوط کی اہمیت اسی لئے ہے کہ انھوں نے نئے انداز سے خط لکھ کر اردو نثر کو ایک سادہ اور سلیس طرزِ نگارش بخشا۔ ان کے یہاں چارلس لیمب کی سی مہر و محبت اور دوست داری کے خوش گوار اثرات ملتے ہیں۔

سرسید نے اردو خطوط نگاری میں مضمون کی قطعیت تخاطب کا خلوص اور زبان کی سادگی پیدا کی۔ محسن الملک، شبلی، حالی، اکبر الہ آبادی، داغ، امیر مینائی، شوکت قدوائی وغیرہ کے خطوط میں فارسی مکتوب نگاری کا عنصر غالب ہے۔ جنگ عظیم کے بعد انگریزی اثر سے مکتوب نگاری بھی متاثر ہوئی۔ ابو الکلام آزاد اقبال، مہدی الافادی، سلیمان ندوی عبد الماجد دریابادی، نیاز فتح پوری، اور رشید احمد صدیقی کے خطوط میں نئی زندگی کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔

ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری نے اپنی مختصر دورِ حیات میں اپنے دوست احباب اور رشتہ داروں کو جو خطوط لکھے تھے۔ وہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ بجنوری کے چند خطوط ان کے مجموعہ "باقیات بجنوری" میں شامل ہیں اور چند غیر مطبوعہ خطوط جو راقمۃ الحروف کو ان کے حقیقی بھانجے مرزا عاشور بیگ سے جو مرزا اکبر بیگ کے فرزند اور مرزا سرور جنگ کے پوتے ہیں۔ ملے ہیں ان خطوط سے ڈاکٹر بجنوری کی علمی استطاعت خیالات کی پاکیزگی اور ان کے شائستہ اطوار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھیں عزیزوں سے جو محبت تھی اس کی جھلک ان خطوط میں دیکھی جا سکتی ہے۔ خطوط دراصل صرف ادب و انشاہی کے آئینہ دار نہیں ہوتے بلکہ ان سے علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخیں بھی مرتب کی جا سکتی ہیں۔ بجنوری کے خطوط اس اعتبار سے بھی اہم معلوم ہوتے ہیں۔ جان سن Johnson نے خطوط کو سیرت و شخصیت کا آئینہ کہا تھا۔ عبد الرحمٰن بجنوری کے خطوط جان سن کے اس معیار پر پورے

اترتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بجنوری کے متعلق ڈاکٹر رشید احمد صدیقی کی رائے تھی کہ وہ مفکر زیادہ اور آرٹسٹ کم تھے۔ خطوط میں بجنوری کا یہ میلان بڑا نمایاں ہو گیا ہے۔ ان میں شگفتگی اور دلچسپی کی وہ مثالیں کم ملتی ہیں۔ جو غالب، مہدی الافادی شبلی اور ابوالکلام کے خطوط میں پائی جاتی ہیں۔ بجنوری نے ان خطوط میں اپنے ذہن اور طرز فکر کی نہایت بے تکلفی کے ساتھ عکاسی کی کوشش کی ہے۔ الفاظ میں سمو کر اپنے کردار کو بے نقاب کر دیا ہے۔

بجنوری جس وقت یورپ پہونچے اس وقت دنیا کے مسلمان بڑی ہی آزمائش سے گزر رہے تھے۔ یورپ کی حکومتیں ترکی سے نبرد آزما تھیں۔ جب بجنوری ترکی پہونچے تو وہاں کے حالات کا بچشم خود مطالعہ کیا ان مشاہدات نے بجنوری کی حمیت قومی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ بہت متاثر ہوئے انھوں نے ترکی سے جو خطوط اپنے والد کو لکھے ہیں ان میں ان کے خیالات کی عکاسی کی گئی ہے۔

بجنوری گو مغربی خیالات کے حامی تھے مگر وہ مشرقی رکھ رکھاؤ کے بڑے پابند تھے۔ انھوں نے بزرگوں کو خاص قسم کے القابوں سے یاد کیا ہے۔ قدیم القاب اور آداب کو جدید انشا پرداز ترک کر رہے تھے۔ مگر بجنوری کے خطوط میں ان کی پابندی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کے علاوہ اپنے چھوٹوں کو بھی ایسے ہی القاب سے یاد کیا ہے۔ اپنے والد کو "حضور قبلہ و کعبہ ام دام ظلکم العالی، عالی حضور قبلہ و کعبہ ام، اور مکرم و محترم مدظلہ العالی لکھتے ہیں اور اپنی والدہ کے لئے حضور امی جان مکرمہ مدظلہا جیسے القاب استعمال کئے ہیں۔ اپنے بھائی اور بہن کے لئے بجنوری نے سادہ اور بے تکلف القاب استعمال کئے ہیں وہ اپنی بہن کو "پیاری بہن ستارہ بانو سلمہا" اور بھائی کو "پیارے بھائی" جیسے سادہ اور مختصر القاب سے مخاطب کرتے ہیں۔ دوستوں کو برادر حبیب من، مکرمی و محبی سلامت

اے برادر شفیق دیار صدیق لکھا ہے خط کے اختتام پر اکثر کمترین تحریر کیا ہوا ملتا ہے مصر کے تفصیلی حالات تحریر کئے ہیں۔ مصریوں کی متواضع طبیعت وہاں کے قدرتی مناظر اور مصریوں کی تعلیمی حالت پر بطور خاص روشنی ڈالی ہے۔

بجنوری نے لندن سے ۲۲ر ڈسمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو ایک خط اپنی والدہ کے نام لکھا تھا۔ جس میں انھوں نے اپنی رہائش گاہ اور اپنے میزبان اور اس کی سیرت کا حال بیان کیا ہے۔ اپنے بارے میں لکھتے ہیں :-

"طبیعت ہنوز اچھی طرح نہیں لگی گھر کے سب لوگ نہایت خلیق اور اچھے اور از حد خاطر کرنے والے ہیں۔ مگر پھر بھی یہاں کے قواعد اور آداب ایسے مختلف ہیں کہ طبیعت لگنا آسان نہیں وہ آزادی اور وہ آرام اصلی جو ہندوستان میں ہے اس ملک میں نہیں۔ ح۱"

بجنوری نے اپنے ہر خط میں اپنے تمام عزیزوں اور دوستوں کی خیریت نام بنام دریافت کی ہے۔ اور انہیں یاد کیا ہے۔ وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مخاطب کے مزاج اور ذوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی باتوں کا ذکر کیا جائے جن سے انھیں دلچسپی ہو یا جن حالات کا جاننا ان کے لئے ضروری ہو۔ مثلاً والدہ کو اپنی تعلیم، اخراجات رہائش گاہ غذا اور دوستوں کے بارے میں مطلع کیا ہے۔ اپنی بہن ستارہ بانو کو مکان کی آرائش، میزبانوں کی عادات و اطوار اور ان کے طور طریق باورچی خانوں کا انتظام اور مکان کی صفائی وغیرہ جیسی چیزوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ انھوں نے اپنے اکثر خطوط میں ہندوستانی عورت کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے

ح۱ مکتوب عبدالرحمن بجنوری مورخہ ۲۲ر ڈسمبر سنہ ۱۹۱۰ء ص ۱۲۷ مکتبہ جامعہ دہلی باقیات بجنوری

ایک خط میں انگریز عورتوں کی تمام خوبیوں کو تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"مگر باوجود ان سب باتوں کے اور ان سب خوبیوں کے ہندوستان کی عورتیں ان سے بہتر ہیں اور اگر ان کی حالت درست ہو جائے اور ان باتوں کا خیال کرنے لگیں تو ان سے کہیں بڑھ جائیں۔" ص۱

بجنوری نے اپنے والد کو جو خطوط مختلف مقامات سے لکھے ہیں ان تمام میں وہاں کی قوموں کی حالات وہاں کے مناظر، سیاسی اور تعلیمی حالات کو بطور خاص اپنا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً ان کا جہاز مصر کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو مسافروں کو شہر دیکھنے کی اجازت دی گئی۔ مصر کی قدیم و جدید عمارتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مصریوں کی عام حالت بیان کی ہے۔ ان کی تعلیمی ترقی کا حال لکھتے ہیں:۔

"مصریوں نے اپنی تعلیم میں بہت کچھ اصلاح کر لی ہے۔ ہماری طرح یہ لوگ ایک غیر زبان کے حاصل کرنے، غیر ملک کے جغرافیہ کا مطالعہ کرنے غیر ملک کی تاریخ پڑھنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے بلکہ مغربی تعلیم اپنی زبان عربی میں حاصل کرتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ اور اپنے ملک کا جغرافیہ پڑھتے ہیں۔ انگریزی اور مغربی علوم و فنون کی کتابیں بہت کچھ عربی میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ ص۲

بجنوری نے اپنے ایک خط میں ترکوں کی زندگی، ان کے لباس اور وہاں کے مناظر کی اچھی مصوری کی ہے۔ ترکوں کے بارے میں وہ تحریر کرتے ہیں:۔

ص۱ مکتوب عبدالرحمٰن بجنوری مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۱۰ء ص ۱۳۹ مکتبہ جامعہ دہلی باقیات بجنوری
ص۲ " " ۲۲ اکتوبر " باقیات بجنوری " " ۱۹۱۰ء ص ۱۲۰

"بلحاظ لباس ترک مغربی ہیں۔ بلحاظ عادات ایشائی مگر ایسے مہمان نواز اور ایسے خلیق لوگ اس وقت روئے زمین پر کہیں نہ ایشا میں اور نہ یورپ میں موجود ہیں۔ اخوت اسلام کا سبق سیکھنے کے لئے قسطنطنیہ سے بہتر کوئی مدرسہ نہیں۔ ص۱

ڈاکٹر بجنوری ترکوں کی قومی حمیت اور ان کے اسلامی جذبات سے متاثر ہو کر اس خط میں لکھتے ہیں :۔

"اگر کسی دن ترکوں کو ان درندہ صفت دشمنوں کی مجموعی طاقت سے بھی لڑنا پڑا تو دنیا دیکھ لے گی کہ ترک یورپ سے اہل مغرب کے خون کے ایک سیلاب عظیم پر واپس جاوئیں گے اور یورپ کا جغرافیہ اور تاریخ بھی نیز منقلب ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے"۔ ص۲

بجنوری کے ان خطوط میں جو ان کے والد کے نام لکھے گئے ہیں زیادہ تر ترکی کے سیاسی حالات کا ذکر ملتا ہے۔ جس وقت بجنوری ترکی پہونچے جنگ بلقان کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ عورت، مرد اور بچے جہاد کے شوق میں بے قرار تھے۔ ان کے جوش و خروش سے بجنوری بہت متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے جنگ پر جاتے ہوئے سپاہیوں اور جانبازوں کی حالت کا بچشم خود معائنہ کیا تھا۔ ترکوں کی قومی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا ہے :۔

"ترکوں میں شرافت، جسارت، دیانت، تقویٰ غرض انسانیت کا ہر ایک جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان عیسائیوں کی رذالت، بزدلی

ص۱ مکتوب عبدالرحمٰن بجنوری مورخہ ۲۱ اگست سنہ ۱۹۱۰ء باقیات بجنوری مکتبہ جامعہ دہلی سنہ ۱۹۴۴ء ص ۱۴۱

ص۲ " " " " " " " ۱۴۲

غریب دی۔ غرض ترکوں کی زندگی جہاں تک ہم سے کسی درجہ کم نہیں۔ ترکوں کی خوبیوں کو ان کی اپنی عیسائی رعایا سے یہ نسبت نہیں بلکہ تمام اہل یورپ سے بھی کی نسبت ہے۔ [1]

بجنوری نے ترکی سرزمین پر جو کچھ بھی دیکھا اس کو اپنے والد کے خطوں میں نہایت دلنشین پیرائے میں تحریر کیا۔ ترکی بادشاہ کی سادگی اور شہزادوں کی عام روش انھیں بہت پسند آئی۔ ان کے طرز معاشرت مہمان نوازی اور رہن سہن نے بھی بجنوری کو متاثر کیا۔ انھوں نے دوسری قوموں سے ترکوں کا مقابلہ کر کے ان کی برتری اور فوقیت کو واضح کرنے کی کوشش کی۔

اردو ادب میں ہمیں بعض ادیب ایسے نظر آتے ہیں جو ترکوں کے جوش قومی اور جذبۂ وطنیت کے بڑے مداح تھے۔ ان میں بطور خاص شبلی، سجاد حیدر یلدرم اور عبدالرحمن بجنوری قابل ذکر ہیں۔ بجنوری ترکوں کے بڑے مداح تھے اور ان کی دل سے قدر کرتے تھے۔ اپنے والد کو انھوں نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء میں ترکی لشکر اور ان کی فوجی ترتیب کا بڑا دلچسپ اور مفصل حال لکھا ہے۔ اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ترکوں کو کتنا عزیز رکھتے تھے۔ اور جب ترک اس جنگ میں شکست سے دوچار ہوئے تو بجنوری کی حساس طبیعت پر اس کا بہت اثر ہوا۔ انھوں نے بڑے دکھ سے اس شکست کے متعلق اپنے ایک خط میں اظہار خیال کیا ہے:-

"اب تو یہ کیفیت ہے کہ ایک ہفتہ بھر سے شب میں نیند بہت کم آتی ہے جب دن میں اطالیوں کی صورتیں دیکھتا ہوں تو اور زیادہ جنون پیدا

---

[1] مکتوب عبدالرحمن بجنوری مورخہ ۲۵ ڈسمبر سنہ ۱۹۱۲ء، ص ۱۶۲ باقیات بجنوری مکتبہ جامعہ دہلی سنہ ۱۹۴۰ء

ہوتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں چلا جاؤں جو آرام نصیب ہو رہے

الٰہی کہاں میں جا کر رہوں کہ مجھ کو سکون حاصل کوئی گھڑی ہو!

بجنوری نے کئی مغربی ممالک کا دورہ کیا تھا وہ جہاں جاتے تھے وہاں کے تعلیمی، تمدنی سیاسی اور سماجی حالات کا اپنے خطوط میں ضرور تذکرہ کیا کرتے تھے۔ پرانی عمارتوں اور تاریخی آثار پر روشنی ڈالتے۔ روم گئے تو وہاں کے تمام مشہور عمارتوں کا تذکرہ کیا وہاں کے گرجا گھروں کا مفصل حال لکھا ہے۔ وہاں کے فنون لطیفہ سے دلچسپی لی اور تعلیمی اداروں کا معائنہ کیا اور اپنے خطوط میں قلمبند کر دئے ہیں۔ ان کے خطوط کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کہیں کہیں سفر ناموں کی سی دلچسپی موجود ہے۔ مختلف شہروں میں اپنے قیام وطعام اور رہائش یا دیگر تفصیلات کو انھوں نے بڑے ہی پر لطف انداز میں تحریر کیا ہے۔ بجنوری اپنے تجربات سفر کو بڑے دلکش انداز سے، روانی کے ساتھ اپنے خطوط میں سمو دیتے ہیں۔ ایک خط مورخہ یکم نومبر سنہ ۱۹۱۲ء کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"ایک اور نہایت قابل دید شئے بادشاہِ موجودہ کے دادا کا بت ہے جو از حد بلند اور شاندار بنایا گیا ہے۔ سینٹ پیٹر کا گرجا اور یہ بت دو ایسی تعمیرات ہیں جو زمانہ مستقبل میں موجودہ طالبہ کی یادگار رہ جائیں گی۔ ص۲

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

روم نہایت پر رونق شہر ہے موجودہ زمانے میں فنون لطیفہ کے لئے

ص۱ مکتوبات عبد الرحمن بجنوری مورخہ یکم نومبر سنہ ۱۹۱۲ء ص ۱۶۲ باقیات بجنوری مکتبہ جامعہ دہلی سنہ ۱۹۴۰ء

ص۲ " " " " " " ۱۹۵ " " " "

مشہور ہے۔ یہاں فن موسیقی اور مجسمہ سازی اور مصوری کے بہترین مدارس ہیں۔ یہاں کے جدید فن مصوری کی اکیڈیمی کو بھی دیکھا اور خوب پایا۔"

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری روم سے وینس گئے تو وہاں کے قابل دید مناظر کی منظر کشی بڑے ہی خوبصورت انداز سے کی مثلاً اس شہر کی اس خصوصیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ وینس ہی جو مختلف چھوٹے چھوٹے جزیروں سے مل کر بنا ہے سڑکیں نہیں ہیں بلکہ نہروں سے سڑکوں کا کام لیا جاتا ہے۔ ایک مکان سے دوسرے مکان میں جانے یا ایک طرف سے دوسری طرف گزرنے کے لئے کشتی کی مدد لینی پڑتی ہے یا پھر پل سے گزرنا پڑتا ہے۔ بجنوری کے خطوط سے ان کے سفر کے پورے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے ایک خط کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"روم سے میرا قصد فلورنس کا تھا، مگر وقت کی قلت کی وجہ سے ارادہ ترک کرنا پڑا۔ روم سے سیدھا وینس آیا۔ یہ شہر بھی روما کی طرح ایک بڑی عظیم الشان حکومت کا پایۂ تخت رہ چکا ہے۔ مگر جس وجہ سے یہ ملکہ امعاً کہلاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ شہر وینس معہ گرد و نواحات کے ایک سو تیس کے قریب چھوٹے چھوٹے قریب قریب واقع شدہ جزیروں سے بنا ہے چنانچہ اس شہر میں بجائے شارعات کے نہریں ہیں اور ایک مکان سے دوسرے مکان میں جانے یا ایک طرف سے دوسری طرف گزرنے کے لئے کشتی یا پل پر سے جانا ضروری ہے۔ ہر مکان کے سامنے ایک کشتی استادہ ہے اور لوگ ہر وقت اِدھر اُدھر کشتیوں میں آتے جاتے ہیں۔ کشتیاں سرکاری حکم سے تمام ایک خاص نمونے پر بنائی گئی ہیں۔ اور سب کا رنگ سیاہ ہے۔ اس کی کیفیت حقیقتاً دیکھنے سے متعلق ہے۔ بیان میں

نہیں آسکتی۔ ص۱

لندن سے بجنوری نے اپنے بھائی کے نام جو خطوط لکھے ہیں۔ ان میں خلوص و محبت کی فراوانی ہے۔ اور جگہ جگہ پیار کے پھول بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بجنوری نے اپنے بعض خطوط میں اپنے بھائی حبیب الرحمٰن کو اپنا مستقبل سنوارنے کی ہدایت کی ہے۔ اور زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے بھائی کے لئے ایک لائحہ عمل بنا کر اس پر کاربند رہنے کی ہدایت بھی کی ہے۔ بجنوری نے صحت و تندرستی کو انسانی زندگی کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ یوروپی ممالک کی ترقی اور حیرت انگیز ایجادات کی وجہ ان کی دانست میں ان قوموں کی قابل رشک صحت ہے وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

یہاں جس قدر علماء اور فضلاء کو دیکھئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون کا دماغ سکندر کے جسم میں مسکن پذیر ہے۔ یا موجودہ زمانے کی مثال سے ہیگل کی روح سینڈو کے جسم میں موجود ہے ۔۔ یہی ان لوگوں کی اعلیٰ تصانیف، عجیب صنائع، حیرت انگیز ایجادات اور قومی کارناموں کا سب سے بڑا راز ہے"۔ ص۲

بجنوری کو اردو زبان کی ترقی سے بہت دلچسپی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی انسان جب تک کہ وہ اپنی قومی اور مادری زبان کا ماہر نہ ہو ترقی نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے بھائی کو اردو تعلیم حاصل کرنے اور سرسید، حالیؔ، شبلی، نذیر احمد، آزاد، غالبؔ اور اقبال

ص۱ مکتوب عبدالرحمٰن بجنوری مورخہ یکم نومبر سنہ ۱۹۱۲ء باقیات بجنوری مکتبہ جامعہ دہلی ص ۱۹۵

ص۲ مکتوب مورخہ ۶ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء بنام حبیب الرحمٰن باقیات بجنوری " " سنہ ۱۹۴۰ء ص ۱۹۹

کی کتابیں زیر مطالعہ رکھنے پر زور دیتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بجنوری کو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے خلوص تھا ان کے خطوط اس کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھیں اپنے چھوٹے بھائی حبیب الرحمٰن سے دلی محبت تھی۔ اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

> "پیارے بھائی! تیرا بھائی تجھ کو ہمیشہ یاد کرتا ہے۔ اور ہمیشہ اسی خیال سے خوش ہے کہ تو اس کے لئے نہ قوت بازو ہوگا۔ بلکہ زندگی کا سب سے بڑا رفیق دوست ہوگا۔ اور امید ہے کہ ہم دونوں اپنے ماں باپ کی خدمت بجالائیں گے۔" ص۱

ایک دوسرے خط میں بھائی کی امتحان میں درجہ اول میں کامیابی سے خوش ہو کر لکھتے ہیں:۔

> "پیارے بھائی شاباش! تیرا محبت نامہ ملا جس سے جماعت میں اول آنے کا مژدہ جانفزا معلوم ہوا جس قدر خوشی ہوئی بیان سے باہر ہے۔ یہ کامیابی انشاءاللہ آئندہ کامیابیوں کی دلیل ہے اور تیری ہمت، لیاقت اور کوشش اور خدا کی عنایت سے امید ہے اب بفضلہ تو ہر امتحان میں سب سے اعلیٰ اور ہر مقابلے میں سب سے بالا رہے گا۔" ص۲

انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی حبیب الرحمٰن کی تعلیم و تربیت میں خاص دلچسپی لی تھی۔ یہاں تک کہ انھوں نے اردو کی ایسی کتابوں کی ایک طویل فہرست بھی لکھ بھیجی تھی۔ جن سے حبیب الرحمٰن استفادہ کر سکتے تھے۔ اپنے اس خط میں انھوں نے تخیل کی بوالعجبیوں پر

ص۱ مکتوب مورخہ ۵ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء بنام حبیب الرحمٰن باقیات بجنوری مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۴۲ء ص ۲۰۶

ص۲ " " ۲۰ اپریل " " " " " ص ۲۰۷

روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ فنون لطیفہ تخیل کے رہین منت ہیں۔ فن کار اپنی قوت متخیلہ کی مدد سے معمولی معمولی چیزوں میں بھی حسن پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہیں اس کے تخیل کا کمال نظر آتا ہے۔ وہ تاج محل کو اسی تخیل کا ایک حسین کرشمہ تصور کرتے ہیں۔ اور لکھا ہے:۔

"تاج محل کیا ہے ایک خیال ہے جس نے ایک صاحب اور نیز صاحب تخیل انجنیر کے اعصاب دماغی سے رگ ہائے مرمریں گزر کیا ہے۔ اور جامد بے جان پتھر کو صورت اور حیات آشنا کر دیا ہے"۔ ص۱

وہ شاعری کو بھی تخیل کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ بجنوری کا تصور فن یہ ہے کہ اچھی شاعری علم اور تخیل کا بہترین امتزاج ہوتی ہے۔ لیکن محض تخیل شاعری کی ہر قدم پر رہبری نہیں کر سکتا۔ بجنوری اس خیال کے حامل ہیں کہ اگر شاعر صرف تخیل پر بھروسہ کرے اور "قصص" اور افسانوں پر ضرورت سے زیادہ زور دے تو وہ کاہل اور نکما ہو جائے گا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"شاعری کیا ہے اعلیٰ تخیل اور صحیح علم کے اجتماع سعدین کا نام ہے اگر صرف تخیل ہی سے کام لیا جائے اور توجہ کو ضرورت سے زیادہ قصص اور افسانوں پر صرف کیا جائے تو طبیعت میں کاہلی اور خیالات میں انتشار اور زندگی میں بے جا حرارت پیدا ہو جانے کا خوف ہے"۔ ص۲

بجنوری نے اپنے ایک خط میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اردو ادب کے کلاسیکی سرمائے

ص۱ مکتوب بنام حبیب الرحمٰن مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۱۱ء باقیات بجنوری ص ۲۰۸

ص۲ " " " " " " ۲۰۹

سے واقفیت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے فسانۂ عجائب، قصہ ممتاز، چہار درویش وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور عبدالحلیم شرر کی ناولوں کو معیاری تصانیف قرار دیا ہے۔ ان کی دانست میں شاعری کا مطالعہ ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور یہ انسان کے لئے روحانی غذا کے مماثل ہے۔ سخت محنت اور مطالعہ کے بعد شاعری کا شغل دماغ میں سکون اور اطمینان پیدا کر دیتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ اردو شاعری دوسری مغربی زبانوں کی طرح وسیع موضوع نہیں رکھتی مگر اردو شاعری میں بڑی دلکشی اور رچاؤ موجود ہے۔ بجنوری نے غالب، حالی، اقبال اور اکبر کی شاعری کو قابل مطالعہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے دیوان وحشت کے متعلق لکھا ہے۔ کہ مرزا غالب کے طرز پر شعر کہنے کی کوشش کا قابل قدر نمونہ وحشت کا دیوان ہے۔ بجنوری نے تاریخ کے مطالعہ سے بھی گہری دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ ہر طالب علم کے لئے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ کیوں کہ اس سے زمانہ گذشتہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے دریافت ہوتے ہیں۔ اور اسلاف کی عظمت اور شوکت سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ مذہبی معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے خطبات احمدیہ، الفاروق، المامون، تذکرۃ النعمان، سوانح مولانا روم، حیات جاوید، یادگارِ غالب، حیات سعدی وغیرہ کو قابل مطالعہ بتایا ہے۔ انھوں نے قواعد کے مطالعہ کو اور علم عروض، دونوں کو استاد کی مدد سے پڑھنے پر زور دیا ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری کے بعض خطوط سے ان کے کردار اور سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کے خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک منکسر المزاج انسان تھے اور خوشامد کو ناپسند کرتے تھے۔ اپنی تعریف و توصیف سے بعض لوگ بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن

بجنوری اس سے اپنے عقیدت مندوں اور دوستوں کو باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ان کی فروتنی کا ثبوت ہے۔ ایک خط میں اپنے ایک مداح کو لکھتے ہیں:۔

"اہل قلم اور اہل علم اور خدا جانے کیا کیا۔ للہ یہ باتیں نہ لکھا کیجئے مجھے اگر بوجہ نادانی قلم سے کبھی کچھ واسطہ تھا بھی تو اب نہیں ہے۔ کسی کو بار بار گذشتہ تقصیر پر گرفت کرنا ناانصافی ہے۔ بہر حال وہ دن گئے کہ میں جاندادہ ہوائے سرہ گذار تھا۔ ص۱

عبدالرحمٰن بجنوری کو اپنے دوستوں سے جو دلی محبت تھی۔ اس کا اظہار انھوں نے بڑے ہی دل نشین پیرایے میں کیا ہے۔ خط کا جواب نہ دینے کا شکوہ کرنے پر بجنوری کا جواب ملاحظہ ہو:۔

"سب شکایتیں بجا، میری کوتاہ قلمی ناقابل معافی ہے۔ مگر مجبور ہوں بلکہ معذور، تاخیر ہے۔ تقصیر نہیں۔ اول تو ویسے ہی مجھے خط لکھنے سے بہرہ نہ تھا یہاں کی مصروفیت نے بہانہ پیدا کر دیا مگر گو اس قدر خاموش ضرور رہا آپ کے خیال سے کبھی غافل نہیں ہوا۔ زندگی کا بہترین زمانہ آپ ہی کی محبت اور دوستی میں گزرا۔ اب ویسا وقت پھر نہیں آنے کا۔ پھر اگر ہم زندہ پھر ملیں گے۔ مگر غم دنیا سے نجات، زنجیر علائق سے آزادی کالج اور جوانی کہاں؟ غرض ساقی زمانہ آتش بجام کر چکا البتہ اس بزم کی یاد مغتنم ہے۔" ص۲

ص۱ مکتوب عبدالرحمٰن بجنوری مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۱۱ء باقیات بجنوری ص ۲۱۷

ص۲ " " " باقیات بجنوری ص ۲۲۱

بجنوری کی انسان دوستی ان کی تحریروں سے نمایاں ہے۔ وہ ذات پات کی تقسیم کے قائل نہیں تھے۔ اور انسانوں کو مذہب کے خانوں میں بٹا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے اکثر خطوط میں احترام آدمیت اور انسان دوستی کا جذبہ موجود ہے۔ ایک خط میں لکھا ہے:۔

"عیسائیوں، یہودیوں، کیتھولک پراٹسٹنٹ سب خاندانوں میں کم و بیش رہا ہوں۔ انسان سب ایک ہیں۔ سب میں ایک ہی طرح کی خوبیاں اور عیب موجود ہیں"۔ ص۱

عبدالرحمٰن بجنوری کو علی گڑھ سے دلی ربط تھا۔ ان کے کردار اور شخصیت کو نکھارنے میں علی گڑھ کی درس گاہ کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔ اس درس گاہ نے جن قابل اور لائق افراد کو جنم دیا تھا۔ ان میں عبدالرحمٰن بجنوری بھی شامل ہیں۔ وہ اس درس گاہ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے دلی لگاؤ کا اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر وقت علی گڑھ سے وابستہ رکھنا چاہتے تھے۔ ایک خط میں اپنے دوست کو لکھتے ہیں:۔

"ابھی تک کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ کہاں کام شروع کروں گا علی گڑھ سب سے بہتر ہے۔ مگر میں تو ہزار علی گڑھ کی جانب رجوع کرتا ہوں۔ علی گڑھ ہی کو میری قربت گوارا نہیں"۔ ص۲

بجنوری کو علی گڑھ یونیورسٹی کے انتظامی امور سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے

ص۱ مکتوب عبدالرحمٰن بجنوری مورخہ ۳ جون ۱۹۱۱ء باقیات بجنوری ص ۲۲۹

ص۲ " " " ۱۳ مارچ ۱۹۱۱ء " " ۲۱۸

یونیورسٹی کے آئین اور دیگر فلاحی امور سے گہری دلچسپی لی تھی۔ ایک خط کے جواب میں اپنے دوست کو لکھتے ہیں :-

یونیورسٹی کے متعلق یہ سن کر کہ اب تک آئین شائع نہیں ہوا اور جملہ آئین دو نشستوں میں بن کر رہ گیا سخت افسوس ہے۔ خرابی ہے جو سوائے زمانے کی خندہ زنی کے کچھ اور بھی نتیجہ برآمد ہو۔ اگر کچھ ہے سچائی کہئے اخلاقی جرأت کہیئے تو وقار الملک میں اگر ان میں نہیں تو قوم میں نہیں ہے[1]

ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کو علی گڑھ یونیورسٹی کے متعلق ہمیشہ تردد رہا کرتا تھا۔ وہ بیرونی ممالک گئے لیکن تعلیمی مصروفیات کے باوجود علی گڑھ یونیورسٹی اور طلبا کی بھلائی کا خیال دامنگیر رہا۔

عبد الرحمٰن بجنوری کے چند غیر مطبوعہ خطوط جو مرزا عاشور بیگ صاحب کی عنایت سے راقمۃ الحروف کو ملے تھے نجی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ خطوط انہوں نے اپنی بہن زیب النسا کو جو مرزا اکبر بیگ سے بیاہی گئی تھیں لکھے تھے۔ ان خطوط میں خلوص و محبت کی فراوانی نظر آتی ہے۔ بہن کا خط نہ ملنے پر وہ جس طرح پریشان ہو کر خط لکھتے ہیں۔ اس سے ان کے بے پایاں خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔ جب انھیں اپنی چہیتی بہن کی بیماری کی اطلاع ملتی ہے تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور بھانجی کی پیدائش کی خوشخبری کا تار وصول ہوتا ہے تو وہ باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ اپنے چھوٹے بھائی کی موت سے ان پر کوہ غم ٹوٹ پڑتا ہے۔ والدہ کی موت کا صدمہ کم نہ ہوا تھا کہ بھائی کی اچانک موت انھیں ہراساں کر دیتی ہے۔ خود رنج و الم کا بار اٹھائے ہوئے ہیں مگر بہنوں کو تسلی آمیز خط لکھتے ہیں کہ عزیزوں

---

[1] مکتوب عبد الرحمٰن بجنوری باقیات بجنوری ص ۲۲۰

کی موت کا صدمہ ہر شخص کو اٹھانا پڑتا ہے یہ کوئی نیا بار نہیں ہے جوان پر ڈالا گیا ہے۔ اپنے بھائی کو وہ اپنا دوست اور دست راست سمجھتے تھے۔ ان سے انھیں بہت سی توقعات وابستہ تھیں بھائی کی موت کے بعد وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس خط میں لکھتے ہیں:-

"جان سے زیادہ پیاری بہن!

تمہارا محبت نامہ تاج کے نام آیا پڑھ کر تمہاری جانب سے گونہ اطمنان ہوا جیو بھائی کی موت نے حقیقت میں دنیا میں مجھ کو اکیلا کر دیا۔ انسان کا سب سے بڑا دوست اور مددگار وہ ہوتا ہے جو اس کے خیالات سمجھے اور ان خیالات سے ہمدردی اور اتفاق کرے۔ ماں باپ اور بیوی اولاد تک آدمی کے خیالات کو نہیں سمجھتے جیو کے جانے سے حقیقت میں میرا سہارا جاتا رہا۔ مجھے کیا معلوم ہے کہ میرا بیٹا اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو حوادثات سے بچایا میرا ہم خیال ہوگا یا نہیں۔ لیکن ماں کے موجود ہونے سے گو گھر کی روح نکل چکی تھی ایک قالب قائم تھا امی جان کے مرنے نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اب ماں اور بھائی کی یادگار بھی تم تینوں بہنیں ہی ہو خدا تم کو زندہ اور سلامت رکھے اور ہر طرح کا عیش و آرام دے اور تمام مرادیں پوری کرے جو کچھ زمانے نے ہمارے ساتھ کیا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے یہی دنیا کا قاعدہ ہے۔ زندگی میں جہاں بڑے بڑے آرام ہیں وہیں بڑی بڑی تکالیف ہیں۔ سوائے صبر اور صبر کے چارہ نہیں۔ ص۱

عبدالرحمٰن بجنوری کی تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس پر مغربیت کا رنگ چھایا

ص۱ مکتوب عبدالرحمٰن بجنوری بنام زیب النساء مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۱۷ء بھوپال

ہوا تھا۔ لیکن ان کا دل ہمیشہ مشرق کا پرستار رہا۔ وہ مغرب کی اندھا دھن تقلید کے مخالف تھے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی مغربی تہذیب کی اچھائیوں کو اپنائیں اور اس تہذیب کی خامیوں اور اس کی نمائش طمطراق اور تصنع سے دور رہیں۔ انھوں نے اپنے بعض خطوط میں مغرب کی کورانہ تقلید کرنے والوں پر تنقید کی ہے۔ ایک خط مورخہ ۳ ر جون سنہ ۱۹۱۲ء میں لکھتے ہیں :-

"قومی حالت عجیب ہے۔ ہم اپنے لباس سے شرماتے ہیں۔ اپنی زبان سے شرماتے ہیں۔ اپنے رنگ سے شرماتے ہیں وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ اپنی چیزوں کے استعمال پر خود قادر اور ان کے فوائد سے خود واقف اور ان کی خوبیوں سے خود آگاہ نہیں۔ پھر اس کا علاج کیا ہے میری خود سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تقلید مغربی کے سیلاب کو کس طاقت سے روکا جائے۔ مگر جہاں تک افراد کا تعلق ہے ہر شخص کا فرض ہے کہ ذاتی کوشش سے تمام مغربی علوم و حکمت کو ہندی بنانے کی کوشش کریں۔"

عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنے اکثر خطوط میں اپنے رشتہ داروں اور کم عمر دوستوں کو نصیحت آمیز باتیں بھی تحریر کی ہیں۔ ان کے اکثر خطوط میں اس کی جھلک موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود انھیں اپنی اس کمزوری کا احساس تھا۔ چنانچہ اپنے ایک خط مورخہ ۵ ر جنوری سنہ ۱۹۱۱ء میں وہ اپنی ناصحانہ روش کے بارے میں رقمطراز ہیں :-

"اگر تم میرے بڑے ہوتے اور میں چھوٹا ہوتا اور یہ خط تم مجھ کو لکھتے تو میں ضرور کہتا کہ میاں چوں کہ خود سب مراحل طے کر چکے ہیں۔ ناصح بن گئے ہیں۔ اگر خود کو کوئی یہ سب باتیں کرنے کو کہہ دیتا اور کر لیتے تو ہم بھی دیکھتے۔ مگر تم زیادہ سعادت مند ہو۔ جن باتوں کو قابل عمل پاؤ اور

جن سے تم نود اتفاق کرو ان کی جانب کوشش کرو کیوں کہ زندگی کا حقیقی کار ساز خدا ہے۔ تدابیر پر ہمیشہ تقدیر غالب ہے۔ انشاءاللہ جس راستہ سے تم آؤ گے محافظ حقیقی اپنے سایۂ عاطفت میں بحفاظت تم کو ترقی کے انتہائی عروج تک پہونچا دیں گے ہمیشہ میری یہی دعا ہے۔"

عبدالرحمٰن بجنوری کے خطوط سے ان کے بعض حالات زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھیں تلاش معاش میں سرگرداں پھرنا پڑا تھا۔ اور کس طرح انھیں مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ مگر انہیں بیرسٹری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ایک علم دوست آدمی تھے اور شعبہ تعلیم میں ہی ملازمت کرنا چاہتے تھے۔ بیرسٹری کرنے کے لئے ابتدائی سرمایہ کی ضرورت تھی لیکن ان کی مالی حالت اس کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ وہ علی گڑھ ہی میں ملازمت کے خواہاں تھے۔ لندن سے اپنے عزیز دوست بیرسٹر محمود کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

رفیق شفیق و حبیب صدیق:

تسلیم۔ یہ خط ایک نہایت ضروری امر کے متعلق رقم ہے جس میں تمہاری امداد مستمر تصدق کی امداد کا خواہاں ہوں۔ میرا قصد اور خیال یہ ہے کہ اگر علی گڑھ کالج والے مجھ کو پروفیسر قانون کی حیثیت سے کالج میں ملازمت دے سکیں تو پریکٹس کا خیال قطعاً ترک کر دوں اور ہندوستان مراجعت پر براہ راست کالج چلا جاؤں اس ارادہ کی پہلی وجہ یہ ہے کہ میری خاندانی مالی حالت اس قابل نہیں کہ پریکٹس ابتدا کرنے کے لئے قلیل سرمایہ بھی میرے پاس ہو جس سے ایک دو سال پریکٹس کے چل جانے تک انتظار کر سکوں

دوسرے چاہتا ہوں کہ زندگی کو تصنیف تحریر کے مشغلہ میں صرف کرنے کی کوشش کروں بس چاہتا ہوں کہ تم مندرجہ ذیل شرائط کی بنا پر مسٹر تصدق سے صلاح کر کے سلسلہ جنبانی کرو۔ ان کے علاوہ باقی معاملات تمہاری رائے پر چھوڑتا ہوں :۔

(۱) میں پریکٹس نہیں کروں گا۔

(۲) قانون کے علاوہ کوئی مضمون نہیں پڑھوں گا۔

(۳) معلمی کے علاوہ انتظامی یا ماسوا کوئی کام نہیں کروں گا۔ اگر یہ ممکن نہ ہوا تو ہندوستان آنے سے قبل کسی اور جانب رخ کروں گا ملک شدا تنگ نسیت "۔

بجنوری کے یہ خطوط ان کے نجی حالات اور ان کے ذاتی خیالات کی غمازی کرتے ہیں۔ خط ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں انسان اپنے حقیقی روپ میں نظر آتا ہے۔ دوسری اصناف میں، شاعر اور ادیب کی شخصیت اپنے چہرہ پر نقاب ڈال لیتی ہے۔ لیکن خطوط شخصیت کی بھرپور مصوری کرتے ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی بہت دوستی تھی۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کے تعلق سے ڈاکٹر عبدالحق کو مفید مشورے دئے تھے۔ اور اردو زبان کی ترقی کے متعلق ان کے پاس کئی تجاویز تھیں جس کو انھوں نے انجمن ترقی اردو کے اجلاس میں پڑھنے کے لئے روانہ کیا تھا۔ ایک خط میں عبدالحق صاحب کو لکھتے ہیں :۔

" میری ناچیز رائے میں جب تک آپ اردو کو نہ صرف دنیوی علوم بلکہ دینی علوم کا ذریعہ تعلیم قرار نہ دیں گے اور اردو علم و ادب اور زبان کے مطالعہ کو بحیثیت ایک مستقل مضمون کے ہر جماعت میں لازم قرار نہ دیں گے اردو یونیورسٹی

اس ملک میں وہ کام نہ کر سکے گی جس کی اس سے امید ہے۔ اردو زبان کو صرف موجودہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے ہی نقصان نہیں پہونچا بلکہ اس سے بھی نقصان پہونچا ہے کہ اردو کو عربی اور فارسی کے مقابلے میں غیر ضروری اور کم وقعت خیال کیا گیا ہے۔" صلہ

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے خطوط میں سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اپنی سادہ طرز انشا سے وہ پڑھنے والے کو متاثر اور محو کر دیتے ہیں۔ ان کے خطوط کی بے ساختگی نے ان کا مقام بہت بلند کر دیا ہے۔ بجنوری مشکل سے مشکل مسئلہ کو بھی نہایت سلیس اور شستہ الفاظ میں بیان کر کے پڑھنے والے پر ان کی معنویت واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ غالب کے مداح تھے۔ غالب کی ہر بات انھیں اچھی لگتی تھی۔ غالب کے خطوط میں جو شگفتگی تھی وہ آج سالوں بعد بھی باقی ہے۔ بجنوری کے خطوط میں بھی وہی رنگا رنگی روانی اور سادگی پائی جاتی ہے جو کہ غالب کے خطوط میں تھی۔ بجنوری کے پاس بے تکلفی اور شگفتگی روانی اور بیساختگی موجود ہے۔ جس سے ان کی ادبی شان میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اکثر خطوط میں انھوں نے عربی جملے استعمال کئے ہیں۔ کہیں کہیں اپنے مطلب کی وضاحت کے لئے اردو اشعار کے ایک دو مصرعے بھی لکھے ہیں۔ اس سے ان کی علمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض خطوط میں سفرناموں کی سی دلچسپی سمٹ آئی ہے۔ بجنوری نے خطوط میں اپنے سفر کے حالات کسی بات کو نظرانداز کئے بغیر بیان کئے ہیں۔ ربط اور تسلسل کا یہ عالم ہے کہ کہیں سلسلہ منقطع ہونے نہیں پاتا اور نہ دلچسپی میں فرق آتا ہے۔ کہیں کہیں پر رقت انگیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے خصوصاً اس وقت جب کہ وہ ترکوں کی حالت کو بیان کرتے ہیں۔ یہاں بجنوری کا طرز مضمون کا سا ہو جاتا ہے:

صلہ مکتوب بجنوری مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۱۸ء بنام مولوی عبدالحق۔ نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم ص ۵۸۳

شاعری

شاعری جذبات، احساسات اور تخیل کی دلآویز ترجمانی کا نام ہے۔ اور شاعری جذبات کے ساتھ شعور و ادراک سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اس میں مواد ہئیت اور موضوع مل کر ایک دلکش اور دلآویز تصویر پیش کرتے ہیں۔ شاعری کے بنیادی عناصر میں جذبہ، فکر، شعور وزن و آہنگ علامات تشبیہات و استعارات صورت بندی، پیکر تراشی، ترنم اور اسلوب وغیرہ کی مکمل ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ متوازن ہم آہنگی سے شعر میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔ شاعری میں شاعر کا ایک جذباتی اور ذہنی تجربہ پنہاں ہوتا ہے۔ اور اس میں اس کی شخصیت کا پرتو نظر آتا ہے۔ شاعری دراصل جذبہ، تخیل اور الفاظ کے بہترین امتزاج کا نام ہے۔ کولرج کہتا ہے کہ شاعری بہترین الفاظ کی بہترین نظم و ترتیب کا نام ہے۔

جدت پسندی کی روایت اردو شاعری میں قدیم سے موجود ہے۔ اور کم و بیش اردو شاعری کے ہر دور میں ملتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ سے لے کر نظیر اکبر آبادی، سودا، انیس، حالی، اقبال، جوش بلکہ فیض، راشد اور میراجی وغیرہ تک جدت اور جدت پسندی کا ارتقائی عمل جاری رہا ہے۔ جس وقت بھی بدلتے ہوئے،

حالات کے تحت کوئی انقلاب برپا ہوا ہے شاعروں میں ضرور اس فکری تبدیلی کا عکس نظر آتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سرسید کی تحریک کے زیر اثر ہمارے ادب میں قومی اور اصلاحی شاعری کا آغاز ہوا ہے۔ افادیت کے تصورات شاعری میں داخل ہوئے یہ جدت پسندی کی طرف شاعری کا پہلا قدم تھا۔ آزاد اور حالی نے اردو شاعری میں جدت پسندی کو عام کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ حالی کے بعد بیسویں صدی میں شاعری تجربات کی مختلف منزلوں سے گزرتی رہی۔ آزادؔ اسماعیل میرٹھی اور شرر وغیرہ نے پہلی بار اردو نظم میں ہیئت کے نئے تجربات کی طرف قدم اٹھایا۔ اس دور میں پہلی مرتبہ انگریزی شاعری سے اثر پذیر ہو کر ہمارے فن کاروں نے نئے موضوعات پر طبع آزمائی کی اور اس وقت تک شاعری جن گنے چنے موضوعات میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ اسے وسعت عطا کی۔ اس دور میں اقبال نے شاعری کو مواد اور ہیئت موضوع اور صورت کے کئی رنگ بخشے۔ اکبر الہ آبادی نے ایک نیا انداز پیدا کیا۔ اور چکبست نے ایک نئے آہنگ کو متعارف کروانے کی کوشش کی۔ نظم طباطبائی نے لانگ فیلو اور گرے کی نظموں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ان کا ترجمہ گور غریباںؑ اردو شاعری میں اسلوب کا ایک نیا تجربہ ہے۔ انھوں نے انگریزی شاعری کی تقلید میں ہر بند کے پہلے اور تیسرے اور دوسرے اور چوتھے مصرع کو ہم قافیہ رکھا تھا۔ بقول عبدالحلیم شرر "اردو میں اسٹانزا (Stanza) کہنے کی یہ پہلی کوشش تھی"۔ عبدالرحمٰن بجنوری اور عظمت اللہ خان وغیرہ نے نئے نئے میدان پیدا کیے۔ عظمت اللہ خان بجنوری مرحوم سے بہت متاثر تھے۔

جدید نظم مغربی افکار سے اثر پذیری کا بھی نتیجہ ہے۔ انگریزی تعلیم کے رواج کے ساتھ ساتھ اس کے اثرات بھی بڑھنے لگے۔ مغربی شاعری کا مواد اردو

میں داخل ہو گیا اور رنگا رنگ ہیئت کے تجربے بھی کیے گئے۔

اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ انھیں عام طور پر اردو دنیا غالب کے ایک منفرد نقاد کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان کے خاص دوستوں کو علم تھا کہ وہ شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں انھوں نے چند نظمیں لکھی تھیں۔ بجنوری کی منظومات جو دستیاب ہوئی ہیں وہ جدید اردو شاعری میں ایک اہم تاریخی مقام رکھتی ہیں۔ گو ان کی تعداد کی کمی کی بنا پر انھیں کسی بڑے پرگو شاعر کی صف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی ان میں تخیل کی جو تازگی اور شگفتگی ملتی ہے اور ہیئت میں جو جدت طرازیاں نظر آتی ہیں وہ اردو شاعری میں جدید رجحانات کے نقوش کا پتہ دیتی ہیں۔

بیرسٹر آصف علی بھی عبدالرحمٰن بجنوری کے بے تکلف اور عزیز دوستوں میں شامل تھے۔ انھوں نے بجنوری کے تعلق سے اپنے دیوان "ارمغان آصف" کے دیباچے میں لکھا ہے:-

"جیتے جی عبدالرحمٰن بجنوری نے سوائے چند بے تکلف دوستوں کے کسی پر یہ ظاہر تک نہ ہونے دیا کہ وہ شعر بھی کہتے تھے شاید ۱۹۱۳ء میں انھوں نے اپنی پہلی نظم میرے انتہائی اصرار پر سنائی نہایت کم گو تھے مگر ریزہ الماس تراشنے والے کی طرح ہر شعر اور ہر لفظ پر محنت کیا کرتے تھے۔ اور پھر خود بھی جوہریوں کی پرکھ رکھتے تھے۔ عربی و فارسی الفاظ کے استعمال میں وہ غالب کے پیرو تھے۔ مگر بعض اوقات ضرورت سے زیادہ جرأت سے کام لیتے تھے عروض کی چھان بین اور مختلف زبانوں کے اوزان و بحور کو انھوں نے نہ صرف خاص مطالعہ کا مستحق سمجھا بلکہ ۱۹۱۴ء میں بڑی محنت سے

اور جانکاہی سے ایک بسیط کتاب لکھنے کے ارادے سے عروض کا ایک رسالہ تیار کیا تھا"۔ صلہ آگے چل کر انھوں نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن بجنوری کو عروض پر عبور حاصل تھا چھوٹے سے چھوٹا نقص بھی فوراً کھٹک جاتا تھا۔ وہ اس مغربی اسکول کے پیرو تھے۔ جو قید سے آزاد ہو کر شعر کہنے پر زور دیتا ہے۔ وہ جدید شاعری کے قائل تھے جس میں لطافت خیال اور نزاکت معنی کو محض صنائع کی پابندی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور رعایت لفظی کو نقص شاعری تصور کیا جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری مشرقی قدروں کے قدر دان ہونے کے باوجود جدید خیال کے حامی تھے۔

عبدالرحمٰن بجنوری ایک جدت پسند شاعر تھے۔ اور جیسا کہ اس سے قبل کہا جاچکا ہے بجنوری کو اوزان اور بحور پر عبور حاصل تھا شعر کے لئے قافیہ اور ردیف سے زیادہ، لطافت خیال اور نزاکت معنی کو ضروری سمجھتے تھے۔ غالب کے پرستاروں میں تھے اس لئے غالب ہی کے انداز میں شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں معنی آفرینی اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی سب سے پہلی نظم "فاھیلی" ہے۔ اس میں انہوں نے ایک خوبصورت اور حسین سنگ مرمر کے بت کو دیکھنے کے بعد اپنے تاثرات کو نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بت قدیم صناع "میلو اور میدیچی کے بنائے ہوئے ہیں۔ جنھوں نے دو حسین اور خوبصورت دوشیزاؤں کے بتوں کو جدا جدا تیار کیا تھا۔ ان بتوں کو دیکھنے کے بعد عبدالرحمٰن بجنوری سوچتے ہیں کہ سنگ مرمر کو جب تراش کو ایک حسین متشکل شکل دیدی جاتی ہے تو اس پتھر کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے حسن جب تک پتھر میں خوابیدہ تھا اس کی

صلہ بیرسٹر آصف علی۔ ارمغان آصف۔ دیباچہ ص ۴

کوئی قیمت نہیں تھی. جب اس کو ایک ماہرِ فن کار نے اپنے تخیل کی مدد سے خوب صورتی بخشی تو وہ ایک ابدی شئی بن گیا. جس وقت فن کار نے پتھر کو تراشنے کے لئے تیشہ اٹھایا وہ نازنین حسینہ خوابیدہ تھی بالکل اسی طرح جس طرح شکم مادر میں کوئی نوزائیدہ سو رہا ہو. بجنوری نے اس نظم میں بڑی خوب صورت تشبیہات اور بڑی دلکش امیجری استعمال کی ہے. بجنوری کے ان اشعار سے زبان اور معنی کی خوبی کے ساتھ ساتھ ان کی استعداد علمی کا بھی اظہار ہوتا ہے.

خوبی میں رشک ہر نگین رنگ عزار یاسمین ،
شیشۂ عفت نازنین مرمر بے مثال تھا
سنگ خدائے کی نگاہِ فکر نے جوں شعاع ماہ
خانۂ دل میں پائی راہ جلوۂ کنعاں
جیسے شکم میں طفل ہو سنگ میں سو رہی تھی وہ
کس کے صدائے تیشہ کو خواب گراں محال تھا
روح تصور نہاں جسم تھا صورتِ عیاں
حسن حیاتِ جاوداں ان کا بہم وصال تھا

بجنوری کی ایک نظم "ہندوستان" بھی ہے. جو چھ مصرعوں پر مشتمل ہے. اس میں شاعر نے اہل ہنود کے ایک فلسفہ کو بیان کیا ہے. ہند و فلسفیوں کے بقول نظام شمسی کا بنانے والا "برھما" ہے. دوسرے نظاموں یا نظم و نستی کو اپنی موزوں حالت میں رکھنے والے دوسرے خدا ہیں. اور ان سب پر سایہ فگن "برھما" ہے جو ساری دنیا پر حکومت کرتا ہے. وہ کہتے ہیں. ع

فوق البشر نشستہ ہے ایک ہستی قدیم
مصروفِ غور کف میں زنخنداں لئے ہوئے،
پہلو میں اس کے اک زنِ گلگوں گداز تن
آبِ حیات سینۂ عریاں لئے ہوئے،
مشغولِ نوش چشمۂ آبِ بقا پہ ہے
طفل ایک دہن میں غنچہ پستان لئے ہوئے،

بیرسٹر آصف علی نے اس نظم کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ زنِ گلگوں سے مراد شکم مادر ہے۔ جس نے کائنات کی تخلیق کی اسی کو پاروتی کہا جاتا ہے۔ اور شیو کے پجاری اس کی پرستش کرتے ہیں طفل سے مراد ہندوستان ہے جس کے دورِ حیات میں ابھی شیر خواری کا اختتام نہیں ہوا۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے نظم "موسیقی" اس زمانے میں لکھی تھی جب وہ جرمن فلسفی نطشے کی تصانیف کا مطالعہ کر رہے تھے۔ نطشے ابتدائی تصانیف میں شوپنہاور کا اتنا ہی قائل تھا جتنا کہ واگنر کا، شوپنہاور کے یہاں موسیقی گویا کائنات کا بنیادی اصول تھا۔ عبدالرحمٰن بجنوری بھی اس کے اس تصور سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ نظم چار اشعار کی ہے۔ اس میں بجنوری نے موسیقی کی تعریف کی ہے۔ اور اس کو سن کر روح پر جو سرخوشی طاری ہوتی ہے۔ اس کو بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

جسمِ نغمہ مثالِ شیشہ ہے ، جانِ نغمہ شراب شعلہ ہے
شبنم نوں عذار گل آویز ، نیستی روحِ حسن سے سبریز
وسعت آنجو میں بیخ بستہ ، اک پریشاں صبا کا گلدستہ
بلبلے ہیں سرور کے عریاں ، خواب ہائے شباب ہیں گریاں

اس مختصر سی نظم میں فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ ہوا ہے اور اس میں خیال کی پیش کشی کا انداز غالب کی مشکل پسندی کی یاد دلاتا ہے۔

"شمع و پروانہ" کے عنوان سے بجنوری نے ایک مختصر سی نظم جو چھ اشعار پر مشتمل ہے لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے بڑے ہی دلآویز پیرایہ میں شمع اور پروانہ کے وصال کی کیفیت نظم کی ہے۔ محفل میں شمع کی جانب پروانہ اپنی بے خودی میں دیوانہ وار بڑھ رہا تھا۔ اس کے اس رقص پر سب ہی خندہ زن تھے۔ مگر شمع کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ پل بھر میں پروانہ شمع کی آغوش میں سما کر خاک ہو چکا تھا۔ ع

در حلقۂ موجِ صبا رقصاں ہوں جوں افشانِ گل
پروانہ سوئے بزم اپنی بے خودی میں تھا رواں
محفل میں تھے ہر چار سو مدہوش شیشے چل رہے
آتش بدن بے پیرہن اک شمع ان کے درمیاں
سر تا بہ پا ناہید وش اس کا درخشاں جسم تھا،
آوارہ زلف عنبر فشاں بے تاب و پیچیدہ دھواں
محفل طلسم روشنی پروانہ اک رنگین غبار
مانند بوئے گل پریشاں در ہوائے بوستاں
بلور لب فانوس تھے سب خندہ زن اس رقص پر
اک شمع کی چشم حباب آسا سے تھے آنسو رواں
تھی دم زدن میں شمع تو پروانے کے آغوش میں
آغوش میں تھا شمع کے پروانہ لیکن اب کہاں؟

شمع اور پروانہ کے اس قدیم موضوع کو جس اثر انگیز انداز سے بجنوری نے

نے پیش کیا ہے۔ وہ نہایت پر درد اور انوکھا معلوم ہوتا ہے۔ ان اشعار کی دلفریبی پڑھنے والے کا دل موہ لیتی ہے۔ ہر لفظ کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ نگینے کی طرح جڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی ایک اور نظم "اجنبی" ہے جس کو طویل بحر میں بجنوری نے ۱۹۱۴ء میں لکھا تھا۔ یہ نظم تین بندوں پر مشتمل ہے۔ اور ہر بند میں تین مصرعے موجود ہیں۔ ہر بند کے پہلے اور دوسرے مصرعے میں ایک ہی ردیف استعمال کی گئی ہے۔ لیکن تیسرے مصرعے کی ردیف علیحدہ ہے۔ اس نظم کی ہئیت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر بند کا آخری مصرع ایک ہی ردیف میں کہا گیا ہے۔ عبدالرحمن بجنوری نے اس نظم میں قافیے کو اس طرح بکھیر دیا ہے کہ اس سے نظم کے ترنم میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی موسیقیت پڑھنے والے کو متوجہ کر لیتی ہے یہ صحیح ہے کہ بجنوری اردو کے کوئی بہت بڑے شاعر نہیں تھے لیکن ان کی شعری تخلیقات ہماری توجہ کی مستحق ضرور ہیں۔ اس لئے کہ ان کی اپنی نظموں میں مروجہ ہئیت سے انحراف کی کوشش نظر آتی ہے۔ جہاں انھوں نے قدیم ہیئت کے انداز کو جوں کا توں برقرار رکھا ہے وہاں بھی اپنی جدت طرازی اور انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔ ایسی نظموں میں ردیف و قافیے کا مخصوص انداز میں استعمال ان کی اختراع پسندی کا ترجمان نظر آتا ہے۔ اس نظم میں ایک مسلسل بہاؤ نظر آتا ہے۔ پہلے دو بندوں میں ایک اجنبی محبوب کے حسن کو سراہا گیا ہے۔ اور اس کے بعد آخری مصرع میں اپنے جذبات کا اظہار ہے۔ ایک اجنبی محبوب سے دوبارہ ملنے کی توقع عبث ہے۔ لیکن اس کی محبت کا تیر شاعر کے دل پر چل گیا ہے۔ اس نظم میں بجنوری نے بڑے خوب صورت استعارے اور تشبیہات استعمال کئے ہیں۔ تشبیہات کی ندرت اور تازگی ان کی نظم نگاری کا ایک نمایاں وصف ہے۔ یہ خوب صورت نظم ملاحظہ ہو۔

صنمِ فرنگ، قمر جبین، بتِ سیم رنگ، غضب حسین
وہ عذارِ نازک و شرمگین کہ رقیب ساغر آتشین

وہ ہوائیں کاکل ازفریں جو شباب تاقبِ شب رواں
ورقاتِ غنچۂ گلاب گوں، دو لبِ گداز پراز فسوں

مژہ دراز و نگوں میں نہاں، دو دیدہ نیلگوں
کہ سحر کے پردۂ ارغواں میں فضائے گنبدِ آسماں

تجھے میں نے دیکھا ہے اک نگاہ نہیں مجھ سے تو ذرا آشنا
ترے عشق میں ہوں میں مبتلا بسلاسلِ الم و بلا

مجھے کیا پتہ کہ ہے اب کہاں تجھے کیا خبر گئی کس کی جاں

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری شاعر تھے۔ وہ پہلے اپنے نام کے ساتھ سیوہاروی لکھا کرتے تھے۔ اسی تخلص سے ان کی ایک نظم "مخزن" میں مارچ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کا عنوان "قانونِ فنا" ہے۔ یہ نظم ان کے مجموعۂ "باقیاتِ بجنوری" میں شامل نہیں ہے۔ اس نظم میں بجنوری نے قدرت کے اصل قانونِ فنا پر بہت ہی فلسفیانہ انداز میں اپنے خیالات کو نظم کیا ہے۔ موت و حیات کے رشتہ پر انھوں نے جس خوبی سے روشنی ڈالی ہے وہ زبان پر ان کی قدرت کو ظاہر کرتی ہے۔ دنیا کیوں پیدا ہوئی اور اس کا کیا مقصد ہے اس پر مختلف فلسفیوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ڈارون کا نظریہ "ارتقاء" کا ہے اور ابوالحسن اس کو "کون" کے مسئلہ سے تعبیر کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ منصور نے انا الحق کہا تو گردن زدنی قرار دیا گیا۔ اسی کی موت سے یہ عقدہ کھلا کہ دراصل روحِ انسانی خدا کی ذات کا پرتو ہے آخر میں بجنوری یہ کہتے ہیں کہ خدا کی بخشی ہوئی زندگی دراصل انسان کیلئے

ایک سنزا سے کم نہیں۔ چوں کہ یہ نظم بجنوری کے مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ اس لئے یہاں نقل کی جاتی ہے۔ ع:

قانونِ فنا

آفرینش کیوں ہوئی عالم کا کیا ہے مقتضاء
فلسفی کہتے ہیں تکوین ابد اور ارتقاء
بعض کہتے ہیں کہ ہے قانون اس کا انقلاب
پر اصل میں ہے مسلط اس پر قانونِ فنا
الحسن اور ڈاروِن اس سے کریں گو اختلاف
پر ہے قانون فنا ہستی عالم کا مضاف
ہیں اندھیرے راستے ہو ارتقا یا انقلاب
"لا" ہی وہ ایک راہ ہے جس کو کہہ سکتے ہیں صاف
جب کہ دی منصور نے پہلے انا الحق کی صدا
سب نے اس کو قابل نفرین و دیوانہ کہا
دار پر ٹیکں دیا جب موت نے عقدے کو کھول
تب یہ جانا سب نے تھا منصور میں پنہاں خدا
ظاہرا انسان گو خالق سے اپنے دور ہے
نور ہے ذات خدا پر خاک میں مستور ہے
پر تمیز باؤ تو دہتی نہیں بعد فنا
روح انسانی بھی شمل ذات اکبر نور ہے

جب ہوا خالق کا انساں پر عتاب اولین
جنت الفردوس سے بھیجا گیا سوئے زمین
زندگانی ہے سزا اور موت راہ بازگشت
تا ازاں راہ بر مکان خوش باز آید آدمیکین

ڈاکٹر بجنوری نے اس نظم میں کئی تلمیحات استعمال کر کے اپنے مطلب کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

"صبح بنارس" کے عنوان سے بجنوری نے گیت کے انداز پر ایک نظم کہی تھی۔ اس میں انھوں نے عام روایتی ڈگر سے ہٹ کر ہیئت کا نیا تجربہ کیا ہے۔ عظمت اللہ خاں نے اردو نظم میں ہندی پینگل سے مدد لی۔ اور اس کو اردو نظم نگاری میں رائج کرنے کی کوشش کی تھی ان کا یہ تجربہ کامیاب رہا۔ بجنوری نے ہندی الفاظ کی مدد سے نظم میں ایک نئی شیرینی اور دلآویزی کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس نظم میں مادی حسن کو فانی اور "مایا" بتا یا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

یہ ستھری ستھری آنکھیں یہ لمبی لمبی پلکیں
یہ تیکھی تیکھی چتون یہ سندر سندر درشن
مایا ہے سب مایا ہے
یہ گورے گورے گال یہ کالے کالے گال
یہ پیاری پیاری گردن یہ ابھرا ابھرا جوبن
مایا ہے سب مایا ہے
کل جھوٹا ہے سنسار اک سچا منزل ہار

ڈاکٹر بجنوری نے جہاں اپنی نظموں کے عنوان انوکھے رکھے ہیں وہیں خیال بھی انوکھا

پیش کیا ہے۔ مندرجہ بالا نظم ایک جوگی کی صدا ہے۔ جو نظم کی گئی ہے۔ اس قسم کی ایک اور نظم میں ہیت کا نیا انداز ملتا ہے۔ اس نظم کا عنوان "بچے اور بڑے" ہے۔ (اندلسی گیت) ہے یہ نظم گیت کے فارم میں لکھی گئی ہے جو جدید شاعری میں ایک منفرد آواز معلوم ہوتی ہے۔

بَچّے اور بَڑے

دیکھا گیا ہے
گودی میں سوتے
سپنے میں بچے
ہیں سارے ہنستے

دنیا کے نقشے
ہیں خواب سارے
دھوکے ہیں جن کے
ہیں سارے ہنستے

دیکھا گیا ہے
گودی سے سوتے
اُٹھنے پر بچے
ہیں سارے روتے

لیکن جب اٹھتے

خواب گراں سے

بچے ہوں جیسے

ہیں سارے روتے

بجنوری کی نظم نگاری کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی نظموں میں کوئی چبھتا ہوا اچھوتا خیال پیش کرتے ہیں۔ اختصار ان کی نظم نگاری کا نمایاں وصف ہے۔ بجنوری کے مجموعۂ "باقیات بجنوری" میں تین اشعار کی ایک چھوٹی سی خوب صورت نظم "یادگل" کے عنوان سے ملتی ہے اس میں بجنوری نے بڑے ہی دلکش انداز میں پھولوں پر منڈلاتی ہوئی تیتریوں کو اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے۔ ع

وہ گالوں پر زردی کہ جوں زعفراں

پڑی تھی جہاں اور نہاں بیتیاں

اڑی ایک اتنے میں سوئے نہاں

دیا اپنی باہوں کو گردن میں ڈال،

وہ پتی نہ تھی بلکہ تھی تیتری

تصور میں تھی گل کا منہ چومتی،

بجنوری کی ایک مختصر ترین نظم "دعا" ہے جس میں صرف دو اشعار میں شاعر نے اپنا مافی الضمیر کو ظاہر کیا ہے۔ فارسی کے شاعر عمر خیام کی خواہش یہ تھی کہ کسی درخت کے سایہ میں اسے محبوبہ کی قربت اور جام شراب نصیب ہو۔ عمر خیام کی یہ آرزو ان کی رومانی طبیعت کی غماز ہے۔ لیکن بجنوری کی پاکیزہ اور شائستہ آرزو اس سے مختلف ہے۔ اس زمانے میں اردو شاعری میں کچھ تو

مغرب کے اثر سے اور کچھ ٹیگور کے ترجموں کی وجہ سے فطرت سے دلچسپی کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ بجنوری کی بعض نظموں میں یہ میلان موجود ہے۔ ان کے یہاں جامن کے سایہ جوئے رواں تتلیوں اور درخت کی ٹوٹی ہوئی پتیوں کا ذکر اس رنگ کو چوکھا کر دیتا ہے۔ ع

دُعا

جامن کے سائے کے تلے جوئے رواں اور نیم ناں
شامل ہیں جس میں سب مرے بچے اور ان کی نیک ماں
پیغمبری ہو یا شہی یا ہو حیات جاوداں
مجھ کو یہی بس دیجیو آب زلال اور نیم ناں

ترکی قومی گیت کے عنوان سے بجنوری نے ایک ترکی قومی گیت کو نظم کیا ہے۔ اس میں بارہ شعر ہیں۔ شاعر نے ترکی کے سرفروشوں کو وطن کی حفاظت کرنے اور بہادری سے جنگ لڑنے اور کامیاب لوٹنے کی دعا دی ہے۔ آخر میں بادشاہ کی صحت اور سلامتی کی بھی دعا کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ع

ہوں شادماں اہل وطن — حق سے ملی تازہ حیات
اس میں نہیں اصلاً سخن — لشکر نے دی ہم کو نجات
زنجیر قہر و ظلم کو — سب ٹکڑے ٹکڑے کر دیا
صد آفریں اے غازیو — آزاد ملت کو کیا
لشکر کو ہو مظفری — ہر معرکے میں اے خدا
دارا ز عمر بادشاہ — دارا ز عمر بادشاہ

اے رایت عثمانیہ — فتح و ظفر ہے تیرا کار
حب وطن میں ہر گھڑی — صلح و اماں تیرا شعار

باہم برادر ہم ہیں سب — اسلام کے دلدادہ ہیں
راہ وطن میں ہر گھڑی — جاں دینے کو آمادہ ہیں
لشکر کو ہو منظفری — ہر معرکے میں اے خدا
دارا ز عمر بادشاہ — دارا ز عمر بادشاہ

ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کی ایک اچھی نظم جس کو کئی ادیبوں اور شاعروں نے سراہا ہے۔ "نٹ راجا" ہے۔ یہ نظم باقیات بجنوری میں شامل نہیں ہے اس نظم کو ڈاکٹر عبد الحق صاحب نے انجمن ترقی اردو کے ماہنامہ "اردو" میں شائع کیا تھا۔ اس نظم کا پس منظر ڈاکٹر عبد الحق صاحب نے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب تک اس قصہ کو بیان نہ کیا جائے اس نظم کا لطف نہیں آسکتا۔ اس نظم میں بجنوری نے "شیوجی" کے حیرت انگیز برق سرعت اور پرشوکت رقص کی کیفیت بیان کی ہے یہ رقص ہندو دیومالا میں ایک خاص اور انوکھی چیز ہے۔ اس میں خاص معنے پوشیدہ ہیں۔ ہندو دیو مالا کے مطابق جب شیوجی کو یہ علم ہوا کہ تارگم کے جنگل میں کئی ہزار رشی بد عقیدہ ہو کر لوگوں کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ کائنات ابدی ہے اور روحوں کا کوئی خالق نہیں تو انہوں نے ان رشیوں کو راہ راست پر لانے کے لئے وشنوں کو ایک خوبصورت عورت کے بھیس میں ساتھ لیا اور روانہ ہوئے۔ رشیوں نے ایک حسین عورت کو دیکھا تو اس کو حاصل کرنے کی فکر کرنے لگے۔ اور ان رشیوں کی بیویوں نے خود شیوجی کو جو ایک جوگی کے بھیس میں تھے حاصل کرنا چاہا لیکن جلد ہی ان رشیوں کو شبہ ہوا اور انھوں نے ان نئے آنے والوں کو سراپ دینا شروع

کیا۔ لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر انھوں نے مختلف طریقوں سے تکلیف دینی شروع کی لیکن شیو جی کو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ آخر کار ان رشیوں نے ایک کریہہ منظر مٹھگنے قد کا بھوت نکالا۔ جس کے ہاتھ میں ایک لٹھ تھا۔ شیو جی نے اس کی پیٹھ پر پاؤں رکھ کر رقص کرنا شروع کیا۔ اس رقص کو دیکھ کر رشیوں کو بڑی پریشانی ہوئی کیوں کہ آسمانوں پر تمام دیوتا اس ناچ کو دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ بد عقیدہ رشی شیو جی کے قدموں پر گر پڑے اور ان کے بھگت بن گئے۔ شیو جی کے اس ماہرانہ رقص کو بجنوری نے اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے۔ چوں کہ یہ نظم ان کے مجموعہ میں شامل نہیں ہے اس لئے پوری نظم یہاں نقل کی جاتی ہے۔

نٹ راجا

لغزش میں نشہ کے بت طناز شرابی،
سیماب مقابل
گرداب مماثل
تصویر برنجی میں ہے رقصاں تن شیو جی،
یک دست میں گردش میں رواں شیشۂ عرفاں
زہرابہ نوشین
پرکالۂ نورین

یک دست میں انوار فشاں شعلۂ یزداں

دارائے جہاں بت شکن مادہ باطل،
منصورِ حقیقی
مغلوبِ مجازی
دنیائے دنی طفلک افتادہ غافل

ہیں انگلیاں بے تاب کہ جنبش میں خدائی
سو شوخیٔ مدہوش
موسیقیٔ خاموش
اعجاز ہے ہر ضربۂ انگشت خدائی

آغوش میں فوارۂ یخ بستہ کی برخاب
تحریک خموشاں
خاموشیٔ جنباں
کب قید ہو تقدیر میں رقصاں شیوہ بے تاب

مندرجہ بالا نظم نہ صرف موضوع بلکہ ہیئت کے اعتبار سے بھی انوکھی شان رکھتی ہے۔ اس نظم میں دو بند (Stanza) ہیں۔ جن میں ایک بحر کا انتخاب کرکے ارکان یا افاعیل کو گھٹایا اور بڑھایا گیا ہے۔ اس لئے اس نظم میں چھوٹے اور بڑے مصرعے پائے جاتے ہیں۔ فارم کے اس انداز نے بجنوری کی نظم میں موسیقیت کا اضافہ کردیا ہے۔ جہاں دو بڑے مصرعے لائے گئے ہیں ان میں ردیف و قافیہ موجود ہے۔ اور یہی حال ان کے بعد کے دو چھوٹے مصرعوں

کا ہے۔ لیکن چھوٹے مصرعوں میں ہر جگہ قافیہ موجود نہیں ہے۔ لیکن ردیف ہی کو شاعر نے درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔ روانی اور موسیقیت اس نظم کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ٹیگور کے مداحوں میں تھے۔ انھوں نے ٹیگور کی تصنیف "گیتا نجلی" کا غیر مقفیٰ نظم میں ترجمہ کرنا چاہا تھا۔ لیکن صرف ایک ہی باب کا ترجمہ کر سکے تھے۔ اس نظم کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ ع

موت جس دم دے گی دستک تیرے دروازہ پر
کیا تواضع اپنے مہماں کی بجا لائے گا تو

مرحبا سلطان من حاضر ہے مینائے حیات
نوشِ عیش اور نیشِ غم دونوں کا آمیزہ ہے یہ

عمر کا میری ہے حاصل بس یہی لبریز جام
نوش جاں حاضر جو ہے بہر کرم فرمایئے

مندرجہ بالا نظم بہت ہی قدیم مروجہ اسلوب ہی میں کہی گئی ہے۔ اس میں شاعر نے فارم کا کوئی نیا تجربہ نہیں کیا ہے۔ اس نظم کا ہر شعر ایک علحدہ ردیف و قافیہ رکھتا ہے۔ اس خصوصیت نے شاعر کو اس کے ما فی الضمیر کے اظہار میں مدد دی ہے طرز ادا اور شاعرانہ مرتبہ کے اعتبار سے بجنوری کی یہ نظم ان کی دوسری نظموں کی طرح کسی منفرد اہمیت کی حامل نظر نہیں آتی۔

بجنوری کے قلیل سرمایۂ شاعری میں ایک اہم نظم "معلم الملکوت" کے عنوان سے بھی ملتی ہے۔ انھوں نے اس نظم میں ابلیس کا حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ فرشتوں کے معلم کی حیثیت سے ابلیس کو خاص مرتبہ حاصل تھا۔ خدا نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے تمام فرشتوں اور ابلیس کو حکم دیا۔

فرشتوں نے حکم کی تعمیل کی مگر ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ آدم کو خاک سے پیدا کیا گیا ہے جب کہ وہ خود خالص آگ سے بنایا گیا ہے۔ اور "آئین وفا" غیر کو سجدہ کرنے سے روکتی ہے۔ فرشتے تو خدا کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور اس کا ہر حکم بجا لاتے ہیں۔ مگر ابلیس خدا کی اطاعت کے لئے نہیں بلکہ اس کو چاہنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ رسم محبت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ غیر کو سجدہ کریں۔ خدا تعالیٰ اور ابلیس کے اس مکالمے کو شاعر نے بڑے ہی موثر پیرائے میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بجنوری مرحوم جمالیات کے دل دادہ تھے۔ ان کے اشعار میں جذبات کی گرمی کم ہے مگر تخیل کی اعلیٰ ترین قوت موجود ہے، الفاظ کا موزوں استعمال اشعار میں روانی اور شگفتگی پیدا کر دیتا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ع

میں سراپا شعلہ تھا اور وہ سراپا نور تھا
میں کجا اور وہ کجا لیکن نہ اس سے دور تھا
حسن جب اظہار جو، جلوہ کنعاں کوئی نہ تھا
بہر روئے یار اس دم میں ہی تو آئینہ تھا
سب سے پہلے معرفت سے میں نے ہی جانا اسے
سب سے پہلے میں نے عالم میں ہی پہچانا اسے
عمر ہا یوں شعلہ افشاں رہ کے یہ نار عظیم
بجھ گئی پسماندہ باقی رہ گئی خاک لیئم
وائے قسمت اتھا نہ میں واقف یہ ہے خاک رقیب
کاش اس دم مجھ کو ہوتا علم اے میرے نصیب

عرش کا پایہ پکڑ کر روتا، کہتا اے خدا!
خالقِ کون و مکان! فریاد ہے عالم پناہ!
کر نہ پیدا اس کو روئے ارض پر، یہ بدنہاد
ڈالے گا عصیاں سے اپنے کل خدائی میں فساد
تھا یوں ہی امرِ قضا، ہونا جو تھا وہ ہی ہوا
امرِ حق صادر ہوا فرمانِ حق پورا ہوا،
کل فرشتوں نے گِل مردود کی تخمیر کی،
اور آب و گِل سے اس کی صورت اک تعمیر کی
قلب ماہیت سے عاری کالبدِ عریاں سفید
بے پر و شہبال، چشم و سر سیاہ دندان سفید
وارثِ تختِ خلافت، رونقِ باغِ جناں
ہے یہ آدم سب کرو سجدہ اسے خورد و کلاں
حکمِ باری پر ملائک نے اسے سجدہ کیا
سب خمیدہ ہو گئے اک میں ہی باقی رہ گیا
اس کو سجدہ کرنے میں کیا کچھ تجھے انکار ہے؟
ہاں مجھے انکار ہے، انکار ہے بس عار ہے
عار ہے؟ کہتا ہے کیا! ڈر! تجھ پہ ہے قہرِ خدا
عار ہے تجھ کو، ملائک تک نے جب سجدہ کیا
ان کی حالت اور ہے اور میری حالت اور ہے
رسمِ طاعت اور ہے رسمِ محبت اور ہے

حکم ربی ہے کہ میں سجدہ کروں لیکن نہیں

غیر کو سجدہ کروں! مجھ سے تو یہ ممکن نہیں

ابلیس خدا تعالیٰ سے کہتا ہے کہ انسان روئے ارض پر فساد پھیلائے گا۔ اس لئے اس کا پیدا نہ کرنا ہی بہتر ہے مگر خدا نے ابلیس کی ایک نہ سنی اور حضرت آدم کو انسان کی شکل دے دی گئی۔ پھر خدا نے کل فرشتوں اور ابلیس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ بجنوری کا خیال ہے کہ ابلیس خدا کی محبت میں سرشار تھا۔ اس لئے اس نے غیر خدا کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اس سے جہاں اس کی سرکشی ظاہر ہوتی ہے وہیں اس کی محبت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یہ موضوع اردو شاعری کے لئے نیا ہے۔ عبدالرحمن بجنوری نے ایک قدیم مذہبی واقعہ کو اپنے منفرد طرز فکر کی وجہ سے اچھوتا رنگ عطا کیا ہے۔ "محشر خیال" میں سجاد انصاری نے بھی آدم و ابلیس کے اس واقعہ کو ایک انوکھے طرز میں پیش کیا تھا۔

مختصر یہ کہ بجنوری بحیثیت شاعر اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں جس کی طرف ہمارے نقادوں نے ابھی پوری طرح توجہ نہیں کی ہے۔ ان کی شاعری میں خیال کی ندرت و تازگی بھی ہے۔ اور طرز ادا کی دلفریبی اور جاذبیت بھی ہیت کے نئے تجربوں کا لطف بھی ہے اور مروجہ سانچوں کا کلاسیکی رچاؤ بھی۔

تنقید نگاری

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری تنقید نگار کی حیثیت سے اردو نثر میں ایک منفرد مقام کے حامل نظر آتے ہیں۔ محاسن کلام غالب ان کی مشہور تصنیف ہے۔ جب انجمن ترقی اردو نے دیوان غالب کو شائع کرنے کی تجویز منظور کی تو عبدالرحمن بجنوری کو اس کام کے لئے منتخب کیا۔ انھوں نے دیوان غالب کے مختلف اور متداول نسخوں کا باہم مقابلہ کر کے دیوانِ غالب کی تدوین کی اور اس پر ایک سیر حاصل مقدمہ بھی سپرد قلم کیا۔ جس میں انھوں نے غالب کی شاعری کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی تھی۔ غالب کے کلام کو اس مقدمہ میں انھوں نے بڑے ہی دل نشین انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی وفات کے بعد صرف مقدمہ کو ہی "محاسن کلام غالب" کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ اس کتاب میں بجنوری نے مشرق اور مغرب دونوں ادبیات سے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے حصول تعلیم کے سلسلہ میں مغرب کے کئی ملکوں کا سفر کیا تھا۔ اور یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مشرق بھی مغرب سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ انھوں نے مغرب کے مقابلے میں مشرقی تخلیقات کو پیش کرنے کی کوشش کی تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ان کی تخلیقات بھی مغربی تخلیقات کے برابر ہیں۔ اسی لئے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی تنقید میں تقابلی انداز نمایاں ہیں۔ انھوں نے مشرق اور مغرب کے فنکاروں کا تقابلی مطالعہ کر کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش

کی ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے اردو کی تقابلی تنقید میں گہرائی اور گیرائی پیدا کی۔ محاسن کلام غالب میں انھوں نے غالب کی شاعری کے کسی پہلو پر اظہار رائے سے پیشتر کسی مغربی شاعر فلسفی بت تراش یا مصور کا حوالہ ضرور دیا ہے۔ گوئٹے سے غالب کا موازنہ کر کے یہ بتایا ہے کہ "دنیا میں اگر کسی شاعر سے غالب کا موازنہ ہو سکتا ہے تو وہ گوئٹے ہے کیوں کہ دونوں کی ہستی انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے"۔

عبدالرحمن بجنوری کی تقابلی تنقید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مغربی شعراء اور فنکاروں سے اپنے شاعروں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس تقابل کے ذریعہ سے ان کی کسی انفرادیت کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تقابلی تنقیدوں میں یہ احساس بھی موجود ہے کہ ہمارے فنکار دنیا کی عظیم ادبی شخصیتوں سے آنکھیں ملا سکتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے میکائل آنجلو کے اس قول کا حوالہ دیا ہے کہ "مجسمہ ساز بت کو مرمر تراش کر نہیں بناتا بلکہ حقیقت میں ابتدا ہی سے بت سنگ سفید میں موجود اور جلوہ نمائی کا منتظر ہوتا ہے۔ ماہر فنکار صرف پتھر کی اس عارضی چادر کو علحدہ کر دیتا ہے"۔ وہ کہتے ہیں کہ غالب کے اشعار اور ان کے ساختہ الفاظ کی بھی یہی حالت ہے۔ غالب نے اپنے فن میں زندگی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ بجنوری نے کلام غالب میں بودلیر، ملارمے، الفرڈ مام برٹ، ہیگل، ڈاروِن اسپنسر، فان ہارٹ مان، برگساں، سپینوزا، برکلے، نطشے، ہورلیس اور ہومر کے اقوال کی جھلک غالب کے اشعار میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

تقابلی تنقید کے اصولوں سے مدد لے کر مغرب کے فنکاروں کا غالب سے موازنہ ومقابلہ کیا ہے۔ لیکن اسی کتاب میں وہ ان لوگوں پر تنقید کرتے ہیں جنھوں نے اپنے شعراء اور ادیبوں کے فن کا مغربی مصنفین اور شاعروں کے کلام سے موازنہ کیا ہے وہ اس کو مغرب کی کورانہ تقلید سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اپنے فنکاروں

کی عظمت کے اظہار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انہیں دوسروں کا مدمقابل ثابت کیا جائے۔ جیسا کہ بجنوری رقمطراز ہیں:-

"تنازع للبقا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل اور خیال کا موازنہ مغربی اقوال اور آرار سے کرنے لگے ہیں۔ یہ وہ غلامی ہے جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔ پس کیا تعجب ہے اگر یورپ زدگی کے زمانے میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شیکسپیئر، ورڈس ورتھ ٹینی سن سے مقابلہ کرتے ہیں۔ افسوس یہ کوتاہ نظر نہیں جانتے شاعری اور تنقید پر کیا دانستہ ظلم ہوتا ہے۔" ۱؎

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو اردو تقابلی تنقید نگاروں کی صف میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے غالب کا مقابلہ اور موازنہ بہت سے مغربی مفکروں سے کرکے یہ ثابت کر دیا کہ مشرق میں بھی ایسے بلند پایہ شاعر موجود ہیں۔ جن پر دنیا ناز کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر کلیم الدین احمد نے بجنوری کی تنقید نگاری کو پیروی مغرب کی مضحک صورت قرار دیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ بجنوری قدم قدم پر مغربی شاعروں فلسفیوں اور صناعوں کا نام لیتے ہیں۔ اور ان کے اقوال کو نقل کرکے غالب سے ان کا موازنہ کرکے اپنی یورپ زدگی کو پایا ثبوت تک پہنچا دیتے ہیں۔

تقابلی تنقید بجنوری سے قبل اردو میں موجود تھی۔ لیکن اس تنقید میں اردو شاعروں کا مقابلہ فارسی اور عربی میں کیا جاتا تھا۔ بجنوری نے مغربی علوم سے استفادہ کیا تھا۔ وہ کئی مغربی زبانوں کے ماہر تھے۔ اس لئے انھوں نے اردو شاعروں اور مغربی،

۱؎ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، محاسن کلام غالب (انجمن ترقی اردو علی گڑھ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۵۲ء) ص ۴

فن کاروں کی مشترک خصوصیات پر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اور اردو تنقید کو ایک نئی وسعت سے آشنا کیا ہے۔ وہ محض ظاہری مشابہت کی بنا پر دو فن کاروں میں مماثلت تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کے فن کا تجزیہ کرکے اس قدر مشترک کا سراغ لگاتے ہیں جو دونوں حسن کاروں کے فن کا جوہر ہے۔

بجنوری کی تقابلی تنقید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقائق کی تہہ تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالب کی شاعری کے کسی پہلو کو انہوں نے نظرانداز نہیں کیا ہے۔ یہ بجنوری ہی کی دین ہے کہ اردو کے ارباب ذوق و فکر اور تنقید نگاروں نے غالب کے علاوہ دوسرے شعراء کو بھی اسی تقابلی تنقید کے میزان سے جانچا۔ بجنوری کی تقابلی تنقید معلومات افزا ضرور ہوتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بجنوری پر مغرب کا اثر غالب ہے۔ وہ محاسن کلام غالب کے اکثر ابواب میں مغربی مفکرین کے اقوال نقل کرتے جاتے ہیں۔ اور پھر غالب کے اشعار کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ کسی بڑے شاعر کے کلام پر کن کن زاویوں سے نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ فنون لطیفہ کے حوالہ سے ادب کو کیوں کر جانچا جاسکتا ہے اور تنقید کی تقابلی صورت کسی قدر وسعت مطالعہ کی طالب ہے۔ محاسن کلام غالب سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ بعض نقادوں کو یہ تنقید غلطیوں پر مبنی معلوم ہوتی ہے لیکن ایسا سمجھنا بڑی ناانصافی ہوگی۔ بجنوری کے انداز فکر کو تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی ان کے مذاق شعر و ادب اور وسعت مطالعہ کی داد دینی پڑتی ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بجنوری کے متعلق اظہار کیا ہے:-

> ڈاکٹر بجنوری نے غالب کو اتنی اونچی محراب پر سجادیا کہ سب کی نظریں حیرت اور مسرت سے اس کی طرف مرکوز ہوکر رہ گئیں۔ انھوں نے مغرب کے اعلیٰ شعراء اور مفکرین کی صف میں غالب کو لاکھڑا کیا۔ [1]

---

[1] رشید احمد صدیقی غالب فن اور شخصیت جشن صد سالہ غالب نمبر ص ۵

ڈاکٹر بجنوری نے جس وقت ہوش سنبھالا ہندوستان پر مغربی تسلط قائم ہو چکا تھا۔ انھوں نے مغربی ماحول میں تربیت پائی تھی۔ اور کئی مغربی ملکوں کا سفر کیا۔ اردو وہ اپنے دور کے مغربی ادب کے ماہروں میں شمار ہوتے تھے۔ شعری تجزیہ کے لئے انھوں نے مغرب ہی کے اعلیٰ ادب کو اپنا معیار بنایا۔ وہ مغرب کے دلدادہ ہونے کے باوجود پکے مشرقی تھے۔ بجنوری نے مغرب کی اندھا دھند تقلید کو قوم کے لئے مضر قرار دیا ہے۔ وہ مشرقی شاعروں اور ادیبوں کے بڑے قدردان تھے اور ان کی قدر و قیمت کو متعین کرتے ہوئے یہ مبالغہ جذبہ پرستاری کا رہین منت معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تنقید میں تاثراتی رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے حسن سے اثر پذیر ہونے اور جمالیاتی تجربات کی مختلف منزلوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا ہے۔ بجنوری کے مضامین کی تعداد محدود ہے۔ ان میں "محاسنِ کلام غالب" میں ہی ان کے خیالات تنقیدی انداز لئے ہوئے ہیں۔ اردو کے بیشتر نقادوں نے صرف اسی کتاب پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اور بجنوری کی خدمات کو سراہا ہے۔ "باقیات بجنوری" میں بھی چند ایک تنقیدی تصورات نظر آتے ہیں۔ کلام غالب کے متعلق بجنوری کی یہ تنقید تنقید ہی نہیں بلکہ تاویل تشریح اور تفسیر ہے۔ وہ خیال کی تاثراتی وسعتوں اور شعر کے الہامی تصور میں کھو کر شاعر کا مقام متعین کرتے ہیں۔ جمالیاتی تنقید نگاروں میں بجنوری ایک خاص مرتبہ کے حامل نظر آتے ہیں۔ محاسن کلام غالب میں انھوں نے روحانی تنقید نگاری سے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ غالبیات کی تاریخ میں یہ تصنیف ایک قابل قدر اضافہ اور بہت اہمیت کی حامل ہے۔ وہ غالب کے ابتدائی ماحول ان پر اساتذہ سخن کے اثرات سیاسی و سماجی حالات کا مشاہدہ اور تجربہ وغیرہ سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔ اور غالب کو ایک ایسے عظیم شاعر کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو مغربی مفکروں کے تاثراتی افکار کے سانچوں میں

ٹھیک اترے یہ بجنوری کی غالب سے بے پناہ عقیدت مندی کا اظہار ہے۔ رومانی نقاد، ادب کی جانچ پڑتال میں اپنے ذوق کو خاص اہمیت دیتا ہے اور اپنے احساسات اور ردعمل کی روشنی میں شاعر یا فن کار کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ یوں تو ہر قسم کی اچھی تنقید کا نقطۂ آغاز ردعمل ہی ہوتا ہے۔ لیکن تاثراتی اور جمالیاتی تنقید میں اس نقطۂ آغاز ہی کو نقطۂ انجام بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بجنوری کے تین بیانات مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

(۱) شاعری انکشاف حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں، شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔

(۲) ~~کہیں~~ پانی رشی بائی نے محض معنی جو عشق و الفت کے مضامین بصورت قطعات افسردگی سے بیان کر کے خاموش ہو جاتا ہے کہاں غالب جو دنیا کو اطلس کی مثال اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے ہے اور جس کا سرود سیارہ بہ سیارہ ہوتا ہوا افلاک الافلاک تک پہونچتا ہے۔

(۳) ۔ کبھی کبھی ایک ایسا پیغمبرِ سخن دنیا میں آتا ہے جو نظریات و قواعد زبان سے آزاد اور صرف روح القدس کا ترجمان ہوتا ہے۔" ~~ـــ~~ [۱]

بجنوری نے محاسن کلام غالب کا آغاز ہی جذباتی انداز میں کیا ہے انھوں نے ہندوستان کی الہامی کتابوں میں غالب کے دیوان کو شامل کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک مقدس وید اور دیوان غالب۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے۔ جو یہاں حاضر نہیں۔ کونسا نغمہ ہے

---

[۱] ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، محاسن کلام غالب صفحہ نمبر ۱۳، ۵، ۱

جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔" بجنوری ایک سچے رومانی فن کار کی طرح جذباتی نظر آتے ہیں۔ وہ ادبی فن پاروں سے لذت حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کو حصول انبساط کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ ان کے حسن و عشق کے نظریہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عینیت پسند ہیں۔ وہ اس تصور کے حامی ہیں کہ عشق ایک ایسا نور ہے جو خلوت و جلوت دونوں کو اپنی ضیاء سے منور کر دیتا ہے۔ عشق پرستش کے جذبہ کا نام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہ پیکر معشوق میں نہ خطوط معین میں نہ کسی سنگ میں کوئی خاص مناسبت ہے اور یہ کہ حسن کی تخلیق فن کار کا سب سے اہم منصب اور اس کے فن کا راز ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری کی تنقیدوں میں جذبات کی فراوانی ہوتی ہے وہ کسی ادبی اکتساب کے مطالعہ سے مسرت حاصل کر کے اس سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں تجزیاتی انداز کی بجائے تاثراتی رجحان کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں جذبات اور وجدان کی روشنی میں تنقیدی عمل کی تکمیل ہوتی ہے۔ ادب کی افادیت اور مقصدیت سے زیادہ اس کی جذباتی قدر و قیمت بجنوری کے پیش نظر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:-

> "ایک سچے رومانی فن کار کی طرح عبدالرحمٰن بجنوری کا دل وفور جذبات کا آئینہ ہے۔ وہ ادبی کارنامے سے صرف لذت حاصل کرنے کے قائل معلوم ہوتے ہیں اور اپنی مسرت اور بصیرت میں دوسروں کو شریک کرنے کے کم روادار ہیں۔ وہ عقل سے زیادہ وجدان واضح تصورات سے زیادہ ناقابل بیان اور مرئی کیفیات کو پسند کرتے ہیں۔" [1]

---

[1] ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری، ادب اور تنقید صفحہ ۲۵۴

ڈاکٹر بجنوری شاعری کو الہامی چیز اور عطیہ الٰہی مانتے ہیں۔ ان کی دانست میں کسی خیال کی مادی بنیاد اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک کہ اس میں وجدان یا الہامی کیفیت موجود نہ ہو۔ مرزا غالب ایک رومانی مزاج شاعر تھے۔ ان کے کلام میں الہامی کیفیت اور فلسفیانہ نکات کی تلاش بجنوری کی اعلیٰ استعداد کی دلیل ہے۔ انھوں نے غالب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خاموش ویرانوں سے زیادہ شہروں کے پرشور کوچوں کو پسند کرتے تھے۔ جہاں زندگی رقصاں و فرحاں ہوتی ہے۔ گویا غالب کی شاعری میں اس خصوصیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری تہذیب و تمدن کی رنگینیوں اور تابانیوں کی مظہر ہے۔ بیک وقت غالب کی شاعری میں تصوف اور زندگی کی رنگینیوں اور تابانیوں کی تلاش بجنوری کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے۔ ڈاکٹر بجنوری ایک ماہر فن کار کی طرح غالب کی شاعری کے مختلف تاثراتی گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تاثراتی تنقید میں ایک عالمانہ رنگ کے ساتھ ساتھ ایک تاثراتی رنگ و آہنگ بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے تخیل کی مدد سے غالب کی شاعری کے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ تنقیدی جائزہ باوجود رومانی اور تاثراتی ہونے کے گہرائی کا حامل ہے۔ وہ ادبی اصطلاحات اور پرشکوہ رنگین جملوں کا اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ قاری اصل موضوع کو فراموش کر کے انھیں کے الفاظ کے طلسم میں کھو جاتا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے غالب کی شاعری کو وسعت عطا کی اور مختلف تاثراتی گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔

بجنوری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کا تاثراتی لہجہ اس وقت شدت اختیار کر لیتا ہے۔ جب کہ وہ غالب کا مقابلہ مختلف مغربی فلسفیوں اور مصوروں سے کرتے ہیں۔ غالب کو وہ ایک فلسفی شاعر سمجھتے ہیں۔ انھوں نے مرزا غالب کو

رب النوع کہا ہے۔ اور غالب کو یکتائے زمانہ مان کر ان کی عظمت کے معترف ہوئے۔ انھوں نے دیوان کے ہر مصرعہ کو تار رباب تصور کیا۔ محاسن کلام غالب میں غالب کی تعریف وتوصیف کے ساتھ ساتھ بجنوری کی شخصیت بھی ابھر آتی ہے۔ قاری غالب کے ساتھ نقاد کی بھی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مشہور نقاد ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:-

"محاسن کلام غالب کے مطالعہ کے وقت بار بار اس کا احساس ہوتا ہے کہ نقاد شاعر کی شخصیت کے بجائے اپنی شخصیت کو ابھار رہا ہے۔ اور اپنی علمیت اور قابلیت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ محاسن کلام غالب میں بجنوری کی شخصیت غالب سے زیادہ بلند و بالا نظر آتی ہے۔ ص۱

ڈاکٹر بجنوری نے جدید تنقید نگاری میں اپنا انفرادی مقام حاصل کیا۔ اور ان کی نظر، انسانی تہذیب کی وسعت اور اس کے پیمانوں پر پڑی۔ انھوں نے غالب کے کلام سے غالب کی ذہنیت کا پتہ چلانے کی کوشش کی۔ اور اس سے اخذ شدہ نتائج کو قاری تک پہنچانے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ اس تنقید میں عقیدت مندی کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے غالب کے قہقہوں میں متانت اور سنجیدگی کا پتہ لگایا۔ ان کی طبیعت میں کائنات کے فلسفیانہ ادراک اور انسانیت کے گہرے غم کی جھلکیاں دیکھیں انھیں غالب کے کلام میں قہقہوں کی شکل میں رنج والم درد وغم کے انبار ملے۔ لکھتے ہیں:-

"غالب کی طبیعت میں رحم ہے وہ انسانی کمزوریوں پر لب آشنا نہیں بلکہ

ص۱ ڈاکٹر شارب ردولوی جدید اردو تنقید اصول و نظریات اترپردیش پبلشرز وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنو ص ۲۸۷

چشم آسا رو تے ہیں"۔

بجنوری نے غالب کے ذہن تک رسائی حاصل کر کے غالب کی شاعری کو نیا غالب عطا کیا اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ انھوں نے غالب کو مغرب اور مشرق کے میزان میں اپنے وجدانی تاثرات سے جانچا اور رائے قایم کی ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری کی تاثراتی تنقید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جہاں بھی شاعری کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ وہ انتہائی رومانیت پسند نظر آتا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں:۔

"کتاب قدرت ایک تاریک کتاب ہے جس کے اوراق پر سوائے شعراء کے کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اس ضیاء میں ہر شئے ایک نئی صورت اور کیفیت میں مشاہدہ ہوتی ہے۔ لیکن شعشعۂ برق کی مثال دم زدن میں غائب ہو جاتی ہے۔ اور پھر وہی ظلمت چھا جاتی ہے"۔ ص۱

حالی کے بعد اردو ادب میں جس رومانی رجحان کی ابتدا ہوتی ہے۔ بجنوری اس کے سب سے بڑے علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے نقطہ نظر کی وضاحت محاسن کلام غالب میں نظر آتی ہے۔

حالی اور بجنوری نے غالب کے تنقیدی مطالعہ کے لئے راہ ہموار کی جس کے نتیجے میں غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف گوشے منظر عام پر آ گئے۔ بجنوری نے غالب کی تنقید میں تحسین اور تعریف کے پہلو کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا۔ غالب کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے غالب کی زندگی کے تمام خدوخال اور ذہنی

ص۱ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری محاسن کلام غالب انجمن ترقی اردو ص ۲۵

رجحانات کو واضح کرنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تنقیدوں میں تاثراتی انداز کے علاوہ نفسیاتی مطالعہ کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ انھوں نے بڑی کامیابی سے نفسیاتی تنقید کے مختلف عناصر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی:

"غالبؔ کو نفسیاتی اسلوب تنقید کی روشنی میں سب سے پہلے بجنوری مرحوم ہی نے پیش کیا"۔ ص[۱]

بجنوری نے شعر میں محض جذباتِ انسانی کے اظہار اور اس کی ترجمانی ہی تک اپنے مطالعہ کو محدود نہیں رکھا ہے۔ بلکہ انھوں نے شاعر کی ذہنی اور نفسیاتی محرکات کا ادراک کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ غالبؔ کو اس کی نفسیاتی کشمکش کے پس منظر میں رکھتے ہوئے کہیں کہیں غالبؔ کے اشعار کی ایسی تاویلیں بھی کی ہیں۔ جو اردو میں پہلی مرتبہ اس آب و تاب کے ساتھ ابھری ہیں۔ اردو میں ڈاکٹر بجنوری کی یہ تصنیف مختصر ضرور ہے۔ جس میں ایک شاعر پر عملی تنقید پیش کی گئی ہے لیکن نفسیاتی تنقید کے مطالعہ کے لئے یہ دوسری ضخیم تنقیدی تصانیف سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ غالبؔ کی شاعری پر بجنوری نے جو تنقید کی ہے اس میں شاید ہی انھوں نے کسی پہلو کو نظرانداز کیا ہو۔ انھوں نے محاسن کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ان کے پیش کردہ دلائل ان کی تنقید میں نفسیات کا رنگ بھرتے ہیں یہ بجنوری ہی کی دین ہے کہ ادبی دنیا میں پڑھے لکھے لوگوں میں ادبی ذوق پیدا ہوا اور غالبؔ کی عظمت کو تسلیم کیا گیا۔ اس کے بعد نقادوں نے دوسرے شعراء کو بھی بجنوری ہی کے اندازِ تنقید

ص[۱] پروفیسر رشید احمد صدیقی باقیات بجنوری دیباچہ انجمن ترقی اردو ص ۱

سے جانچنا شروع کیا۔ نفسیاتی انداز تنقید مغرب ہی کے اثرات کا نتیجہ تھی۔

محاسن کلام غالب کو پڑھتے وقت ایک یہ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے کہ کسی شاعر کے فن کا تجزیہ کرتے وقت اس کی زندگی کے تمام خدوخال اور ذہنی رجحانات کس طرح سامنے لائے جا سکتے ہیں۔ اس منزل پر ڈاکٹر بجنوری نفسیاتی تنقید کے مختلف عناصر کی بہت کامیابی سے ترجمانی کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ عملی تنقید نگاری میں بھی بجنوری خاص اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ انھوں نے شاعر کی فطری صلاحیت اور شعر و فن میں اس کے اظہار کے انداز پر روشنی ڈالی۔ شاعر کی جمالیاتی اور وجدانی کیفیت کے نفسیاتی عوامل کو محسوس کیا۔

ڈاکٹر بجنوری شاعری کو عطیہ الٰہی مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی شعر اس وقت تک عالم وجود میں نہیں آ سکتا جب تک کہ اس میں وجدانی یا الہامی کیفیت موجود نہ ہو۔ اور یہ الہامی کیفیت وہ ہے جو احساسات کے ذریعہ حسن حقیقی تک پہونچنے کا ایک ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس نظریہ کے پیچھے انسانی فطرت کی نفسیات ہی کارفرما ہوتی ہے۔ جس کی رو سے شاعر کی فطری صلاحیتوں کا تجزیہ کرنا ضروری قرار پاتا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری شاعری کو انکشاف حیات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں:۔

"شاعری کو اکثر شعراء نے اپنی اپنی حد نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز، جذبہ اور وجدان، ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے مگر یہ تقسیم خود ان کی خامی کی دلیل ہے۔ شاعری انکشاف حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں، شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ جمال الٰہی ہر شئے میں رونما ہوتا ہے۔ آفرینش کی قدرت جو صفات باری میں سے ہے شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کارخانہ ایزدی میں پوشیدہ

حسن آفرینی میں مصروف ہیں۔ شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔ ص۱

ڈاکٹر بجنوری کا یہ خیال اکثر قدیم یونانی اور مشرقی علمائے فلسفہ کے ہاں بھی موجود ہے مگر اتنی وضاحت سے نہیں ہے بجنوری شعری تخلیق کی مادی شکل کو جمال الٰہی کا پرتو تصور کرتے ہیں۔ اور اس کے بہت سے جواز پیش کرتے ہیں۔ جن کو قدیم شعراء اور نقادوں نے پیش نہیں کیا۔ بجنوری کے خیال میں شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعر تخلیقِ فن میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اسے خوب صورتی یا حسن کی تخلیق کا احساس نہیں رہتا بلکہ وہ لاشعوری طور پر وجود میں آجاتی ہیں۔ اسی کیفیت کو جدید نفسیات کے فن کاروں نے بتایا کہ فن کار نیوراتی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے اس کیفیت کو عطیہ الٰہی قرار دیا۔ وہ محاسن کلام غالب میں لکھتے ہیں:۔

> "مادہ خود بے صورت ہے۔ مادہ میں نہ کوئی خوش صورتی ہوتی ہے نہ بدہیئتی حسن خارج نہیں باطن ہے۔ حسن مادہ کے جسم میں نہیں بلکہ صاحب نظر کی نگاہ میں ہے۔"

جدید سائنسی دور میں مادہ کو اہمیت حاصل ہے۔ انسانی ذہن کو بھی مادہ ہی کی پیداوار تسلیم کیا گیا ہے۔ خیالات اور احساسات کو انسانی ذہن کا عکس تصور کیا جاتا ہے۔ بجنوری نے غالب کی شاعری میں غم والم کے جو عناصر تلاش کئے ان کے نفسیاتی محرکات کا تجزیہ اس سے قبل اس انداز میں کسی نقاد نے نہیں پیش کیا تھا۔ بہت سے ناقدین نے المیہ اور داخلی جذبات کو شاعری کا بنیادی عنصر مانا ہے۔ لیکن وہ محرکات جن کے تحت شاعر جذبات کی حقیقی ترجمانی کر سکتا ہے۔ ان پر کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ غالب

ص۱ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، محاسن کلام غالب انجمن ترقی اردو ص ۱

کی شخصیت اور فن پر اس کے اثرات کا مطالعہ کرکے بجنوری نے تنقید کے میدان میں ایک نئی منزل کا راستہ پیش کردیا۔

ڈاکٹر بجنوری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے شعر میں جذبات کے اظہار اور اس کی ترجمانی ہی تک اپنے خیالات کو محدود نہیں رکھا۔ بلکہ غالب کے کلام کو نمونہ بنا کر اپنے تجزیہ کی ان بنیادوں کو پیش کردیا جس کا مقصد یہ تھا کہ شاعری کے لئے زندگی کے پہلوؤں اور شاعر کے ذہنی اور نفسیاتی محرکات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس طرح انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب کا کلام انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اور انہوں نے اپنے جذبات کی روشنی میں غالب کے ذہن کو جانچنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کو نئی نسل میں روشناس کروانے میں بہت اہم حصہ لیا۔ عبدالرحمٰن بجنوری اپنے اوضاع و آداب میں مشرقی تھے ان کی نظر قدیم علوم پر بہت گہری تھی اور وہ اپنے معاصرین سے کہیں زیادہ مغرب اور اس کی معاشرت کے دلدادہ تھے۔ انہیں جدید علوم سے غیر معمولی شغف اور دلچسپی تھی۔ وہ کئی مغربی زبانوں کے ماہر تھے۔ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی، انگریزی، فرانسیسی اطالوی اور جرمن زبانوں میں دستگاہ رکھتے تھے۔ قانون کی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ فنون لطیفہ سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام

"بجنوری غالب اور سرسید کے بعد گویا سب سے زیادہ جامع اوصاف شخص تھا۔"

اردو کے تقریباً ہر بڑے نقاد اور ادیب نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی ادبی اہمیت کو تسلیم کیا ہے بجنوری نے غالب کو ادبی دنیا میں روشناس کرانے اور ان کا صحیح،

مقام دلانے میں جو قابل قدر کوشش کی وہ ایک گراں بہا کارنامہ ہے۔ اگرچہ کہ بعض نقاد فن اس سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ مگر وہ بھی بجنوری کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بجنوری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ غالبؔ کے کارنامہ کو ہر پہلو سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے مشاہیر اور مختلف کارناموں کو غالبؔ کے دیوان کے پہلو بہ پہلو رکھ کر اور ان میں جو ربط ہے اس کو دریافت کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور "دیوان غالبؔ" اس جملہ کو بجنوری نے ایک کامل اعتماد کے ساتھ لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس جملہ میں مبالغہ آرائی کا اور خود بجنوری کے اپنے تاثرات اور عقیدت مندی کا زیادہ اثر ہے۔ دراصل غالبؔ کو انھوں نے نیا قالب عطا کیا۔ اور آج بھی غالبؔ پر بہت کچھ لکھا جانے کے باوجود بجنوری کے محاسن کلام غالبؔ کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ نقاد آج بھی ان کی وسعت نظر اور عالمانہ انداز تنقید کا وزن محسوس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے غالبؔ کی شاعری کو اپنے اعلیٰ معیار سے جانچنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کسی ادب پارے کو جانچتے ہوئے اس کے موضوع کے ساتھ نہ صرف انصاف کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں بلکہ اس ادبی کارنامے کی ہئیت کے متعلق بھی اظہار رائے کرتے اور شاعر کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر بجنوری نے جہاں غالبؔ کے اشعار میں فلسفیانہ عناصر تصوف اور جمالیاتی اقدار کی جھلک دیکھنے کی کوشش کی وہیں وہ ہئیت پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔

بجنوری کو علم عروض سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ شاعر کے لئے اس علم سے واقفیت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ عروض کی چھان بین اور مختلف زبانوں کے اوزان و بحور کا

انہوں نے بڑی جانکاری اور دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا۔ اور اس پر ایک کتاب تصنیف کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ عروض سے شعر کی صوتی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ان کی موسیقیت شعر کو نئی دل کشی عطا کرتی ہے۔ علم عروض کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بجنوری نے لکھا ہے:-

"بہت سے شعراء جن میں استاد شامل ہیں عروض کو شعر کی تکمیل کے لئے کافی خیال کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ عروض کا مدعا اس موسیقی کی طرف سامعہ کو رہنما کرنا ہے جو قالب شعر کو اپنے دخل سے زندہ کرتی ہے۔" ۱

غالب نے مشکل اور آسان بحروں میں طبع آزمائی کی تھی اور ان کی شاعری میں رواں دواں اور افتاں وخیزاں بحریں بھی موجود ہیں۔ غالب کی موسیقی اور بحروں کا جائزہ لیتے ہوئے بجنوری نے غالب کی فطرت کے تنوع کو ظاہر کیا ہے کہ وہ رائج سانچوں پر چلنے سے انکار کرتے ہیں اور ایک نئی راہ اپنے لئے متعین کرتے ہیں۔

بجنوری نے شاعری میں ابہام کو بھی بہت اہمیت دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ابہام سے شعر کے حسن اور معنویت میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ غالب کی شاعری بھی گوئٹے کے کلام کی طرح عوام کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں تحیر نہ ہو تو اس سے سامع کو دلچسپی نہیں ہوتی۔

زبان کے بارے میں عبدالرحمٰن بجنوری کا نظریہ یہ ہے کہ وہ ایک زندہ حقیقت ہوتی ہے۔ انسانی تصورات ہر دور میں نیا روپ دھارتے رہتے ہیں۔ اور زبان ان

---

۱ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری محاسن کلام غالب انجمن ترقی اردو صفحہ ۳

تصورات کی نئے انداز میں عکاسی کرتی رہتی ہے۔ بقول بجنوری "تصور کے زبان سے ادا کرنے کا نام ہی لفظ ہے"۔ وہ زبان میں "تبدیلی کے قانون کی اہمیت کے قائل تھے۔ اور اس تصور کے حامل تھے کہ سماجی ضروریات اور تمدنی تبدیلیاں زبان کو نئی معنویت اور نئے اسالیب عطا کرتی ہیں۔ اور اگر زبان ان سے ہم آہنگ نہ رہ سکے تو وہ مردہ اور بے جان ہو کر رہ جائے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح فن تعمیر میں اینٹ اور پتھر کی مدد سے خوب صورت پیکروں کی تخلیق کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح شاعری میں برجستہ اور موزوں الفاظ کے مناسب استعمال سے اس کی اثر آفرینی اور دلکشی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک لفظ کو جہاں تک ہو سکے دوبارہ استعمال نہ کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ مرزا نے ایک ہی لفظ کو بار بار استعمال نہیں کیا ہے۔ بجنوری نے فرسودہ محاوروں سے احتراز کرنے پر زور دیا ہے اور وہ اس کے بھی قائل نہیں معلوم ہوتے کہ زبان کو محدود جغرافیائی یا تمدنی حدود میں مقید کر کے اس کی وسعت پر پابندی عائد کی جائے۔ وہ زبان کو ایک آزاد اور نامیاتی حقیقت تصور کرتے ہیں۔ وہ دبستانوں کی مصنوعی تقسیم کو بھی درست نہیں تصور کرتے تھے۔

ڈاکٹر بجنوری کے یہاں قواعد زبان کا ایک انقلابی تصور ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قواعد منطق کا ایک خارجی پہلو ہے۔ اور شاعری منطق کی بندشوں سے آزاد ہوتی ہے۔ وہ شاعری کو ایک ذوقی اور وجدانی چیز تصور کرتے ہیں۔ وہ ان غیر ضروری پابندیوں کے قائل نہیں ہیں۔ جو شاعر کے خیالات کے بہاؤ اور اس کے جذبات کی روانی کو روک دیتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ بجنوری علم بدیع اور علم بیان وغیرہ کی اہمیت کے منکر نہیں ہیں۔ انہوں نے تشبیہ اور استعارے کی صوری اور معنوی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ تشبیہ اور استعارے کے تین کام ہیں اول یہ کہ وہ معنی ،

آفرینی میں اضافہ کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان سے شعر کے صوتی حسن اور کشش میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ تشبیہات و استعارات کا انداز بھی مخصوص ہوتا ہے اور ان میں عہد بہ عہد تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ نیا دور اپنے ساتھ نئی تشبیہات اور نئے استعارے لاتا ہے۔ جو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اور یہی زبان کے ارتقا اور ادبی نشونما کا اٹل قانون ہے۔ بجنوری نے غالب کی نئی تشبیہات اور انوکھے استعاروں کو اس لئے سراہا ہے کہ غالب کے جدید ذہن کا عکس ان میں پوری طرح موجود ہے۔ انھوں نے عربی اور فارسی شعراء کی استعمال کی ہوئی پامال تشبیہات کو برتنے کی بجائے نئی تشبیہات استعمال کی ہیں۔ اور ان سے اپنے نئے تصورات کی ترجمانی کا کام لیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری زبان، قواعد، عروض اور صنائع بدائع کے متعلق ایک ترقی پسند نظریہ رکھتے تھے۔ جہاں انھوں نے قواعد کے غیر ضروری پابندیوں اور محاوروں کے بندھے ٹکے اصولوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ وہیں صنائع بدائع کو مقصد شاعری بنا لینے پر بھی سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر شاعر صنعتوں کے استعمال پر حد سے زیادہ توجہ صرف کرے تو اس کا کلام تصنع پسندی اور تکلف کا نمونہ بن جائے گا۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ صنائع بدائع "شاعری کو زندگی" سے دور کر دیتے ہیں۔ بجنوری کا تصور یہ ہے کہ ظاہری خوب صورتی کی طرف حد سے زیادہ توجہ کرنے کی وجہ سے موضوع کی اہمیت پس پشت جا پڑتی ہے اور شاعر صوتی حسن ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتے ہیں۔ ایسی شاعری قوموں کے انحطاط کا باعث ہوتی ہے۔ وہ زندگی سے محروم ہوتی ہے۔ اس لئے سماج میں زندگی کی نئی لہر نہیں دوڑا سکتی۔ ڈاکٹر بجنوری کے یہ تصورات بتلاتے ہیں کہ وہ ادب کا ایک آفاقی

تصور رکھتے تھے۔ اور ادب کے متعلق ان کا یہ نظریہ تھا کہ وہ انسانی تہذیب کی بقا اور ترقی کے لئے ضروری ہے۔ انھوں نے اپنی آفاقی اور عالمی اقدار کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب کی شاعری کا جائزہ لیا۔ حالی نے ادب کو قومی تہذیب کی روشنی میں پرکھنے پر زور دیا تھا۔ بجنوری نے ایک طرح سے حالی کے خیالات کو اپنا کر انہیں نئی وسعت سے ہمکنار کیا ہے۔ بعض جگہ بجنوری کے خیالات حالی کے خیالات کا پرتو معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے پہلی مرتبہ ادب کو آفاقی منظر بنایا تھا اور ایک ایسا زاویہ فکر پیدا کرنے پر زور دیا تھا۔ جس میں انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کا احساس موجود ہو۔ حالی جدید تنقید کے رہنما مانے گئے ہیں۔ اور ڈاکٹر بجنوری کو پہلا جدید نقاد کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام کے الفاظ ہیں:-

"حالی جدید تنقید کے رہنما ہیں۔ بجنوری صحیح معنوں میں پہلے جدید نقاد ہیں۔ حالی سادہ ہیں بجنوری بلیغ ہیں۔ حالی کی نظر مقصد و اغراض پر رہی۔ بجنوری کی نظر انسانی تہذیب کی وسعت اور اس کے پیمانوں پر رہی ہے۔" ص۱

دراصل دیوان غالب کا یہ مقدمہ نئی نسل کا غالب کی خدمت میں خراج عقیدت ہے۔ باوجود نقادوں کی کڑی نکتہ چینی کے نہ تو غالب کی مقبولیت میں کمی ہوئی اور نہ بجنوری کی بلکہ مقبولیت میں اضافہ ہوا اور غالب کے اشعار میں نئے مفہوم کی جستجو ہونے لگی۔ بجنوری کی تنقید نگاری پر ڈاکٹر عبداللطیف کی تنقید نے ادبی دنیا میں ہلچل پیدا کردی۔ وہ انگریزی ادب کے پروفیسر تھے۔ اور اس کے ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے غالب کو اس مرتبہ کا مستحق نہیں سمجھا جو کہ بجنوری غالب کو عطا کرنا چاہتے تھے۔ محاسن کلام غالب پر مختلف

ص۱ ڈاکٹر خورشید الاسلام "تنقید کے بنیادی مسائل" (مرتبہ آل احمد سرور) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس سنہ ۱۹۶۷ء
ص ۲۶۹

گوشوں سے جو اعتراضات کئے گئے تھے۔ ان میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ بجنوری ہیرو پرستی کا شکار ہو گئے ہیں۔ انھوں نے غالب کے کلام میں مشرق و مغرب کے شعراء کے بہترین خیالات و افکار کا جلوہ دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ غالب کو عالمی ادب میں ایک اہم مقام عطا کرنے کا جذبہ ان کی تنقید کو جذباتیت اور شخصیت پرستی کی کمزوریوں کا آئینہ دار بنا دیتا ہے۔ بعض نقادوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ بجنوری نے غالب کے کلام پر تنقید نہیں کی ہے بلکہ ان پر قصیدہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری کی مخالفت اور تعریف میں غالب کے بہت سے نقادوں کی تحریریں موجود ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے محاسن کلام غالب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ بجنوری نے کئی ایسے جملے لکھے ہیں جو فور عقیدت مندی کا نتیجہ ہیں۔ جن میں نہ تو اعتدال پسندی ہے نہ ہی توازن باقی رہ سکا ہے۔ وہ غالب کے ہر عیب کو ہنر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ان کی تعریف میں اتنے رطب اللسان ہیں کہ دیوان غالب کو الہامی کتابوں کا ہم پایہ قرار دیا ہے۔ اور اس کے الہامی ہونے پر زور دیا ہے۔

ڈاکٹر عبداللطیف، کلیم الدین احمد، ڈاکٹر گیان چند، طالب کاشمیری، عطا محمد شعلہ وغیرہ نے ڈاکٹر بجنوری کی تصنیف محاسن کلام غالب پر اعتراضات کئے ہیں۔ اور اس کو مبالغہ آرائی عقیدت مندی ہیرو پرستی وغیرہ قرار دیا ہے تو ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر خورشید الاسلام رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر شارب ردولوی اور

اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی وغیرہ نے بجنوری کی تنقیدی بصیرت کو سراہا ہے۔ اور انہیں جدید نقادوں میں ایک خاص اہمیت کا مالک قرار دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مغربی تنقید کے اصولوں کو اردو تنقید میں موزوں طریقہ پر رائج کرنے کا سہرا ابھی انہیں کے سر ہے۔

ڈاکٹر بجنوری پر کڑی نکتہ چینی کے باوجود ان کی علمی استعداد اور حکیمانہ انداز نقد

کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بعض مقامات پر بجنوری کا تنقیدی انداز یکسر عقیدت مندی اور پرستاری تک جا پہونچتا ہے۔ غالب ایک انفرادیت پسند شاعر تھے۔ انھوں نے روایتی ڈگر سے ہٹ کر اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔ ان کی انفرادیت اور خود اعتمادی نے بجنوری کو بہت متاثر کیا انھوں نے مغرب کے ادبی نظریات کو غالب کی شاعری میں دیکھے اور دکھائے اور غالب کا مقام متعین کرنے میں اپنے ذاتی تاثر کو بھی شامل کر دیا ہے۔ انھوں نے غالب کے کلام میں فلسفہ اور تصوف کے ساتھ ساتھ انسانیت اور زندگی کے باہمی تعلق کو بھی محسوس کیا ہے۔ اور غالب کی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کلام میں الہامی عنصر کی جھلک دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

رسائل

۱۔ آج کل	مئی ۱۹۷۸ء		دہلی
۲۔ اُردو	جنوری ۱۹۲۱ء		اورنگ آباد
۳۔ اُردو	جولائی ۱۹۲۱ء		"
۴۔ اُردو	" ۱۹۲۳ء		"
۵۔ اُردو ادب غالب نمبر	۱۹۶۹ء		
۶۔ اُردوئے معلیٰ غالب نمبر دوئم	۱۹۶۰ء		دہلی یونیورسٹی
۷۔ الناظر	۱۹۲۶ء		لکھنؤ
۸۔ تمدن	سپٹمبر ۱۹۱۹ء		دہلی
۹۔ زمانہ	جنوری ۱۹۰۷ء		کانپور
۱۰۔ سائینس	جنوری ۱۹۲۹ء		
۱۱۔ سب رس	۱۹۶۹ء		حیدرآباد
۱۲۔ شاعر غالب نمبر	۱۹۶۹ء		بمبئی
۱۳۔ شاعر	اپریل ۱۹۷۱ء		"
۱۴۔ شبستان غالب نمبر	۱۹۶۹ء		دہلی
۱۵۔ صبح ادب	اپریل، مئی ۱۹۷۶ء		لکھنؤ

۱۶۔	علیگڑھ	جنوری	۱۹۱۷ء	علیگڑھ
۱۷۔	فروغ اردو غالب نمبر	نومبر دسمبر	۱۹۶۸ء	لکھنؤ
۱۸۔	مخزن	جنوری	۱۹۱۰ء	لاہور
۱۹۔	"	مئی	۱۹۰۴ء	"
۲۰۔	"	جون	۱۹۰۴ء	"
۲۱۔	"	فروری	۱۹۰۵ء	"
۲۲۔	"	مارچ	۱۹۰۷ء	"
۲۳۔	"	جنوری	۱۹۱۰ء	"
۲۴۔	نگار	مارچ	۱۹۴۶ء	"
۲۵۔	نقوش غالب نمبر			"
۲۶۔	نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم			"
۲۷۔	نیا دور		۱۹۱۶ء	لاہور
۲۸۔	"		۱۹۷۱ء	"
۲۹۔	"		۱۹۷۱ء	"
۳۰۔	نیرنگ خیال اقبال نمبر	ستمبر، اکتوبر	۱۹۳۲ء	
۳۱۔	ہماری زبان	دسمبر	۱۹۷۶ء	دہلی
۳۲۔	"	جون	۱۹۷۷ء	"
۳۳۔	"	مئی	۱۹۷۸ء	"
۳۴۔	"			"

کتابیات

	مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ
۱۔	اسلوب احمد انصاری	ادب اور تنقید	سنگم پبلشنز الہ آباد	سنہ ۱۹۶۸ء
۲۔	بدر شکیب	سرگذشت جامعہ عثمانیہ	کراچی	سنہ ۱۹۷۱ء
۳۔	ایم حبیب خاں	اردو تنقید کے معمار	انڈین بک ہاؤز علی گڑھ	سنہ ۱۹۶۰ء
۴۔	ڈاکٹر سیدہ جعفر	اردو مضمون کا ارتقا	حیدرآباد	سنہ ۱۹۷۲ء
۵	خواجہ احمد فاروقی	ارمغان آصف	دہلی یونیورسٹی	سنہ ۱۹۶۶ء
۶	ڈاکٹر خورشید الاسلام	تنقید کے بنیادی مسائل	علی گڑھ	سنہ ۱۹۶۷ء
۷	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	رشید احمد صدیقی	حیدرآباد	سنہ ۱۹۶۸ء
۸۔	ڈاکٹر شارب ردولوی	جدید اردو تنقید اصول و نظریات	لکھنؤ	سنہ ۱۹۷۶ء
۹۔	شمس الرحمٰن	اردو خطوط	کتابی دنیا دہلی	سنہ ۱۹۴۷ء
۱۰۔	شہنشاہ حسین رضوی	دیوان ثاقب	لکھنؤ۔	سنہ ۱۹۳۶ء
۱۱۔	ڈاکٹر عبادت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقا	کراچی	سنہ ۱۹۵۱ء
۱۲۔	" "	غالب اور مطالعہ غالب	لاہور	سنہ ۱۹۶۲ء
۱۳۔	" "	مقدمات عبدالحق	دہلی	سنہ ۱۹۷۲ء
۱۴۔	عبدالرحمٰن بجنوری	محاسن کلام غالب	علی گڑھ	سنہ ۱۹۵۲ء
۱۵۔	عبدالرحمٰن بجنوری	مجموعہ نثر غالب	لاہور	

مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ
۱۶۔ ڈاکٹر عبد القوی	غالبیات	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	سنہ ۱۹۶۹ء
۱۷۔ ڈاکٹر عبد اللطیف	غالب	جام باغ حیدر آباد	سنہ ۱۹۳۲ء
۱۸۔ ڈاکٹر عبد اللہ	اشارات تنقید	جمال پریس دہلی	سنہ ۱۹۶۶ء
۱۹۔ محمد فاتح فرخ	باقیات بجنوری	مکتبہ جامع دہلی	سنہ ۱۹۲۰ء
۲۰۔ ڈاکٹر کلیم الدین احمد	اردو تنقید پر ایک نظر	دائرہ ادب پٹنہ	سنہ ۱۹۲۰ء
۲۱۔ ڈاکٹر گیان چند	رموز غالب	جمال پریس دہلی	سنہ ۱۹۲۰ء
۲۲۔ محمد حسن	آئینہ غالب	دہلی	-
۲۳۔ محمود الحسن رضوی	اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	دہلی	
۲۴۔ محمد حمید اللہ خان	دیوان غالب نسخہ حمیدیہ	دہلی	سنہ ۱۹۶۶ء
۲۵۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور	روح تنقید	حیدر آباد	سنہ ۱۹۴۰ء
۲۶۔ مختار الدین احمد	نقد غالب	انجمن علی گڑھ	سنہ ۱۹۵۶ء
۲۷۔ ناظر کاکوروی	جائزہ	الہ آباد	سنہ ۱۹۶۰ء